المنار
جلد نمبر 3
شمارہ نمبر 1
ستمبر 2020
مجلس طلبائے قدیم تعلیم الاسلام کالج، امریکہ کا علمی اور ادبی مجلّہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس شمارے میں

پتہ برائے خط و کتابت

editorAlmanar@gmail.com

Click Here to visit TICAA USA **Website**

Click her to visit us on **facebook**

رَبَّنَا وَ اجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَ تُبۡ عَلَیۡنَا ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۲۹﴾

اے ہمارے رب (اور ہم یہ بھی التجا کرتے ہیں کہ) ہم دونوں کو اپنے فرمانبر دار بندے بنا دے۔ اور ہماری اولاد میں سے بھی اپنی ایک فرمانبر دار جماعت (بنا) اور ہمیں ہمارے (مناسب حال) عبادت کے طریق بتا اور ہماری طرف (اپنے) فضل کے ساتھ توجہ فرمایقیناً تُو (اپنے بندوں کی طرف) بہت توجہ کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ البقرہ ١٢٩

غرباء سے حسن سلوک

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس میں یہ تین باتیں ہوں اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت کا سایہ عطا فرمائے گا۔ اور اسے جنت میں داخل کرے گا۔ وہ کمزوروں پر رحم کرے ماں باپ سے محبت کرے اور خادموں اور نوکروں سے حسن سلوک کرے۔　　(جامع ترمذی ابواب صفۃ القیامہ)

ڈاکٹر ساجد علی

قران کریم کی ترویج میں پرنٹنگ پریس کا کردار

بعض یورپی مصنفین نے یہ دعوی کیا ہے کہ مسلمانوں کا پرنٹنگ پریس سے احتراز کرنا محض تاریخی اتفاق یا حادثہ نہیں تھا بلکہ اس کے مذہبی اسباب تھے۔ مسلمان اپنے مذہبی تصورات کی بنا پر پریس کو نہیں اپنا سکتے تھے کیونکہ ان کا مذہب بنیادی طور پر زبانی روایت پر انحصار کرتا ہے۔

اس خیال کو پروفیسر فرانسس رابنسن نے کافی شدومد سے بیان کیا ہے۔ موصوف لندن یونیورسٹی میں ہسٹری آف ساوتھ ایشیا کے استاد رہے ہیں۔ مسلم تاریخ بالخصوص جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی تاریخ ان کا اختصاصی شعبہ ہے۔ کیمبرج ہسٹری کی کچھ جلدوں کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دیے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے 1992 میں لندن میں ایک لیکچر دیا تھا جس کا عنوان تھا:

Technology and Religious Change: Islam and the Impact of Print.

یہ لیکچر اگلے برس جریدے ماڈرن ایشین سٹڈیز میں شائع ہوا۔ اس میں مسلمانوں کے پرنٹنگ پریس کو اختیار نہ کرنے کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی بارہ سو سالہ علمی روایت اصلاً زبانی روایت ہے۔ قرآن کا زبانی ابلاغ مسلمانوں کے تعلیمی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کو حفظ کرنا اور اس کی تلاوت کرنا مسلم تہذیب کا شعار ہے۔ چنانچہ یہ طریقہ دوسرے علوم کے ابلاغ و ترسیل پر بھی اثر انداز ہوا۔ اس لیکچر میں میرے خیال میں کلیدی جملہ یہ ہے:

The Quran was always transmitted orally.

پروفیسر موصوف کا نام بہت بڑا ہے اس لیے واقعاتی غلطی کو بیان کرنا اچھا تو نہیں لگتا لیکن اس کی تصحیح بھی ضروری ہے۔ پروفیسر صاحب نے بیان کیا ہے کہ ان کا لکھنؤ کے فرنگی محل خاندان سے تقریباً ربع صدی پر محیط دوستانہ تعلق ہے۔ اس خاندان کا ایک فرد اس لیکچر میں بھی موجود تھا۔ انھوں نے لیکچر اس فرد اور اس کے خاندان کے نام معنون کیا ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے شاہ اسماعیل شہید کی کتاب تقویۃ الایمان کو سّید احمد بریلوی کی تصنیف قرار دیا ہے۔ صراط مستقیم بھی سّید احمد کے ملفوظات ہیں جو اصلاً شاہ اسماعیل اور ایک اور صاحب کے تحریر کیے ہوئے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے سّید احمد کو شاہ عبد العزیز کے خاندان سے قرار دیا ہے حالانکہ ان کی اس خاندان سے کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔ ان واقعاتی تسامحات سے قطع نظر، مجھے ان کے مسلم تہذیب کے فہم پر کسی قدر حیرت ہوئی ہے بلکہ صدمہ پہنچا ہے۔ میرا تجربہ یہی ہے کہ مغربی دنیا میں بھی زیادہ تر صاحبان علم و تحقیق ابتدائی طور پر قائم کردہ تصورات سے بہت کم باہر نکلتے ہیں۔

پروفیسر رابنسن کو یہ بات بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ تینوں ابراہیمی مذاہب، یہودیت، نصرانیت اور اسلام، اصلاً مبنی بر کتاب مذاہب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں یہودیوں اور نصرانیوں کو اہل کتاب کہا گیا ہے۔

یہ بات معلوم و معروف ہے کہ وحی الٰہی جب نازل ہوتی تو نبی کریم ﷺ فوراً اس کو لکھوانے کا اہتمام کرتے۔ تاریخ میں کاتبین وحی کے نام محفوظ ہیں۔ اگر کچھ صحابہ کرام نے قرآن حکیم حفظ کیا اور ان کے بعد مسلمانوں میں حفظ قرآن کی روایت آج تک جاری و ساری ہے تو اس سے یہ نتیجہ کسی طور پر اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان علم کی ترسیل کے لیے زبانی روایت کو ترجیح دیتے تھے۔ قرآن اگر کسی اختلاف کے بغیر روایت ہوا ہے تو اس کا سبب حفظ نہیں بلکہ اس کا تحریر کیا جانا ہے۔ کسی اختلاف کی صورت میں تحریری متن کی طرف ہی رجوع کیا جاتا تھا۔ احادیث نبوی کو چونکہ تحریر نہیں کرایا گیا تھا اس لیے ان کی روایت میں اختلافات واقع ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ خطبہ حجۃ الوداع کا کوئی متفق علیہ متن موجود نہیں۔

زبانی روایت کا معاملہ بھی صرف احادیث نبوی تک محدود رہا ہے۔ ابتدا میں اس بات پر ضرور بحث ہوئی کہ احادیث کو ضبط تحریر میں لانا چاہیے یا نہیں۔ اس بحث کا فیصلہ بھی تحریر کے حق میں ہی ہوا تھا۔ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ تابعین نے اپنے مجموعے مرتب کرنا
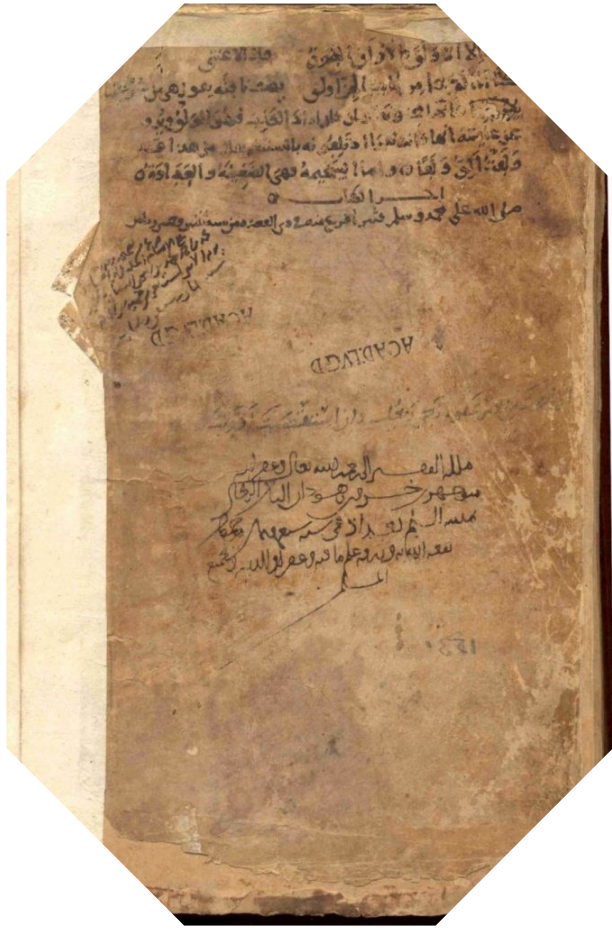
شروع کر دیے تھے۔ جب حدیث کے باقاعدہ مجموعے، جنھیں صحاح کہا جاتا ہے، تصنیف ہو گئے تو زبانی روایت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد علم حدیث کی تعلیم ان کتابوں سے ہی دی جاتی رہی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کی علمی، تعلیمی روایت کو زبانی روایت قرار دینے کا کوئی جواز دکھائی نہیں دیتا۔

یہ عمارت اس مقبول عام مفروضے کی بنیاد پر تعمیر کی گئی ہے کہ عربوں میں قبل از اسلام اور بعد از اسلام کئی صدیوں تک تحریر کا رواج نہیں تھا۔ مشہور یہی ہے کہ مسلمانوں میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ عباسی دور میں شروع ہوا۔ بیسویں صدی میں اس موضوع پر ہونے والی تحقیق اس مفروضہ کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

امریکی پروفیسر روتھ میکلنسن نے سن (1936-37) میں تین اقساط میں سلسلہ مقالات بعنوان "عہد بنو امیہ میں عربی کتب اور کتب خانے" جریدہ The American Journal of Semitic Languages and Literatures, میں شائع کیا۔ اس کے بعد اپریل 1939 میں اسی جریدہ میں مزید معلومات پر مبنی ایک سپلیمنٹ شائع کیا۔ ان مقالات میں اس نے کافی شواہد جمع کیے جن سے پتہ چلتا ہے کہ سن 20 ہجری میں مصر کی فتح کے بعد پپائرس کا استعمال وسیع پیمانے پر شروع ہو گیا تھا۔ بنو امیہ کے دور میں شاعری اور امثال کو ضبط تحریر میں لانے کے علاوہ نثری کتابوں کی تصنیف کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس بات کے بھی شواہد موجود ہیں کہ لوگوں میں کتابیں جمع کرنے کا شوق بھی پیدا ہو چکا تھا۔

پچاس کی دہائی میں مصری محقق ناصر الدین الاسد کی تحقیق بھی روتھ میکلنسن کی بات کی تائید کرتی ہے۔ اس نے مختلف مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ "آغاز اسلام اور عہد بنو امیہ میں سامان نوشت و خواند سستے داموں دستیاب اور ہر شخص کی رسائی میں تھا اور پہلی صدی ہجری
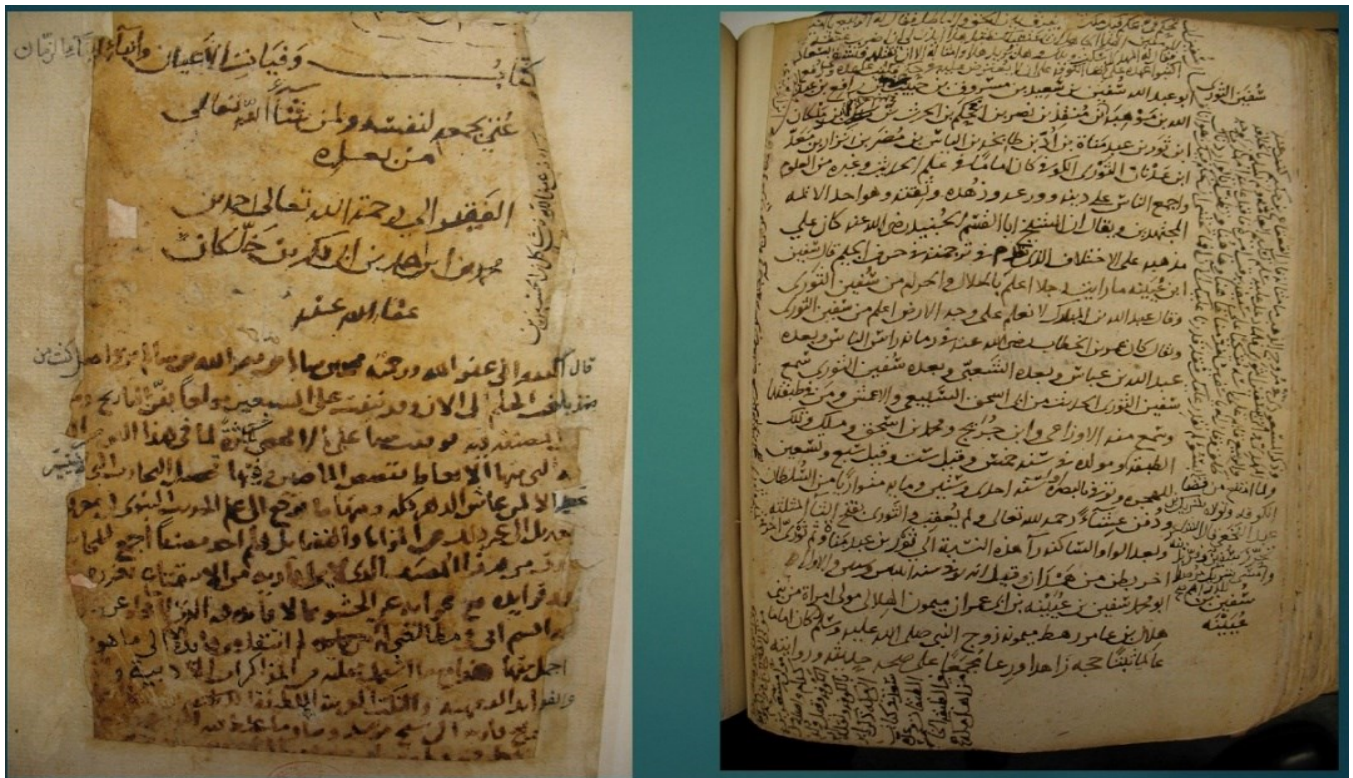
کے نصف تک پہنچتے پہنچتے باقاعدہ کتب خانوں کا سراغ ملنے لگتا ہے۔ (ڈاکٹر خورشید رضوی، ”عربی ادب قبل از اسلام“، ص 283)

بنو امیہ کی حکومت جائز تھی یا ناجائز، ظالمانہ تھی یا نہیں؟ ان سوالات سے اس حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ وہ ایک وسیع سلطنت تھی جو دو براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی۔ رقبے کے لحاظ سے ولید بن عبد الملک کی سلطنت وسیع ترین تھی۔ چنانچہ حکومت کی انتظامی ضرورتیں انھیں علم اور کتاب کے حصول پر مجبور کرتی تھیں۔ جغرافیہ کا علم ان کی بنیادی ضرورت تھی۔ اسی طرح یونانی اور پہلوی دیوان (سرکاری ریکارڈ) کو عربی میں ترجمہ کروانا پڑا۔ ساسانی بادشاہوں کے احوال پر مشتمل ایک باتصویر کتاب کسی قلعے سے ہاتھ لگی تو اسے ہشام بن عبد الملک کے لیے ترجمہ کیا گیا۔ اسی طرح ساسانی شہزادی بہ آفرید کے سامان سے ملنے والی کتاب کو حجاج کے لیے عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ روتھ میکنسن کی یہ بات درست دکھائی دیتی ہے کہ بنو امیہ کے دور کی ثقافتی تاریخ کا از سر نو جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔

جدید تحقیقات کی روشنی میں قبل از اسلام عرب شاعری کے مکمل طور پر زبانی روایت ہونے کا نظریہ بھی علمی طور پر قریب قریب مسترد ہو چکا ہے۔ جیسا کہ معلوم و معروف ہے کہ 1925 میں مارگولیتھ نے اپنے ایک مقالے میں قبل از اسلام کی عربی شاعری کو جعل سازی قرار دیا تھا۔ پھر اسی موقف کا مشہور مصری ادیب طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب میں اعادہ کیا تھا۔ اس نقطہ نظر کا سب سے مفصل اور مدلل جواب مصری محقق ناصر الدین الاسد کی جانب سے دیا گیا تھا جس کی اصابت کو ابھی تک تسلیم کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب نے مذکورہ بالا عالمانہ اور محققانہ کتاب کی جلد اول میں ناصر الدین الاسد کی تحقیق کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ کتبات، دستاویزات اور دیگر شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ”قدیم عرب میں تحریر کا رواج اس سے کہیں زیادہ تھا جتنا بالعموم خیال کیا جاتا ہے۔ عربوں میں فن تحریر اسلام سے کم از کم تین سو برس قبل سے پایا جاتا تھا“۔

فلسطینی مسیحی سکالر عرفان شہید نے رومن ایمپائر اور بیزنطائین کے عربوں کے ساتھ چھ صدیوں پر (64 قبل مسیح سے لے کر 636ء، جنگ یرموک تک) محیط تعلقات پر عمیق تحقیق کی ہے۔ اس تحقیق میں بھی قبل از اسلام کے عربوں میں، بالخصوص چوتھی صدی عیسوی میں، شاعری کے وجود کا پتہ ملتا ہے۔ رومنوں کی تاریخ میں عرب شاعروں کا تذکرہ ملنے کا مطلب ہے کہ عربوں کے ہاں شاعری موجود تھی۔ لہٰذا ان قطعی تردیدی شواہد کی موجودگی میں مارگولیتھ اور طٰہٰ حسین کے موقف میں کوئی جان باقی نہیں رہتی۔

قبل از اسلام دور میں بھی" موضوعات تحریر میں عہد نامے، حلف نامے، میثاق، تجارتی دستاویزیں اور ذاتی خطوط بھی شامل تھے۔ اسی طرح غلاموں سے معاہدہ زر آزادی تحریر میں لایا جاتا تھا۔" (ایضاً) قرآن حکیم نے بھی معاہدات کو لکھنے کا حکم دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں آمد کے بعد یہودیوں اور دیگر قبایل کے ساتھ تحریری معاہدہ کیا تھا جسے میثاق مدینہ کہا جاتا ہے۔

تعجب ہوتا ہے کہ پروفیسر رابنسن نے اپنے لیکچر سے چالیس، پچاس برس پہلے ہونے والی تحقیقات سے اعتنا کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ بہر حال ان شواہد کی بنا پر ان کی اس بات سے اتفاق کرنا ممکن نہیں کہ مسلمان مکتوبہ لفظ کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس موقف کی تردید کے لیے بے پناہ تاریخی شواہد موجود ہیں۔ مسلم تہذیب نے ضخیم تصنیفی سرمایہ پیدا کیا ہے۔ کتب کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ مذہبی علوم کے علاوہ دنیوی علوم کے ہر شعبے میں گراں قدر تخلیقات پیش کی ہیں۔ آج بھی یورپ کے کتب خانوں میں ہزاروں کی تعداد میں سائنسی موضوعات پر عربی مخطوطات موجود ہیں۔ ابن ندیم سے لے کر دور حاضر کے ترک سکالر ڈاکٹر فواد سیز گین نے کتابیات مرتب کرنے کا فریضہ سر انجام دیا ہے جن سے اس تصنیفی سرگرمی کے پھیلاو کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

آٹھویں صدی کے نصف دوم میں مسلمانوں نے چینیوں سے کاغذ بنانے کا فن سیکھا اور اس کو جلد ہی ایک صنعت کا درجہ دے دیا۔ اسی طرح چینیوں سے بلاک پرنٹنگ کا طریقہ بھی سیکھا جو فاطمی عہد خلافت میں کئی صدیوں تک استعمال ہوتا رہا۔ اس پر کتابیں چھاپنا تو مشکل تھا لیکن قرآنی دعاوں اور آیات پر مبنی تعویز چھاپنے کے لیے اس طریقے کو استعمال کیا جاتا تھا۔

اس طول کلام سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اگر پرنٹنگ پریس کو اختیار کرنے میں تاخیر ہوئی تو اس کے اسباب مذہبی نہیں تھے، نہ قرآن حکیم پرنٹنگ پریس کی راہ میں رکاوٹ تھا۔

یہ بات درست ہے کہ ترک علماً ابتدا میں قرآن حکیم کی طباعت کی مخالفت کرتے رہے ہیں لیکن اس کے اسباب شرعی نہیں کچھ اور تھے۔ ترک معاشرہ بڑی حد تک تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ مذہبی عقیدت کا رنگ بہت گہرا تھا۔ ترکوں کی مذہبی عقیدت کا انداز دیکھنا ہو تو عثمانی سلاطین نے مسجد نبوی کی تعمیر نو کے لیے جس انداز کا اہتمام کیا تھا اس کا مطالعہ کافی چشم کشا ہو گا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس پر صلاح الدین محمود صاحب نے ایک بہت عمدہ مضمون لکھا تھا۔

ترک علماء کا خیال تھا کہ پرنٹنگ کے عمل کے دوران میں کچھ ایسے اعمال سے واسطہ پڑ سکتا ہے جو مذہبی کتب کی شان اور تقدس کے منافی ہوں۔ ابتدا میں انھوں نے قرآن حکیم کی جلد بندی کی اجازت بھی بہت مشکل سے دی تھی کیونکہ سلائی کے لیے مقدس صفحات میں سوراخ

کرنا اور ان پر ہتھوڑا مارنا پڑتا ہے۔ تاہم جلد بندی کو اس کی افادیت کی بنا پر قبول کرنا پڑا۔ بصورت دیگر صفحات کے گم ہونے یا ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔

یہی حال پرنٹنگ کا تھا۔ ابتدا میں پریس کی چھپی کتابوں کی ناپسندیدگی کا ایک بڑا سبب یورپ میں شائع ہونے والی عربی کتب میں بہت زیادہ اغلاط کا پایا جانا تھا۔ چنانچہ ابراہیم متفرقہ نے جب پریس لگانے کی اجازت طلب کی تو اس میں بطور خاص اغلاط سے پاک کتابوں کی اشاعت کا ذکر کیا گیا تھا۔ شیخ الاسلام کے خط میں پروف ریڈرز کے تقرر پر اصرار کیا گیا تھا۔

پرنٹنگ میں ایک مسئلہ تکنیکی تھا۔ عربی الفاظ کو ٹائپ میں ڈھالنا ایک دشوار کام تھا کیونکہ ایک ایک حرف کی چار چار شکلیں ہیں۔ ابتدا میں جو ٹائپ بنایا گیا وہ دیدہ زیب بھی نہیں تھا۔ لیکن جونہی لیتھوگرافی کی ٹیکنالوجی وجود میں آئی مسلمانوں نے بلا تاخیر اس کو اپنا لیا کیونکہ وہ کتابت ہی کی توسیع تھی۔ پروفیسر رابنسن خود اعتراف کرتے ہیں کہ جب اٹھارویں اور انیسویں صدی میں قاہرہ اور استنبول میں قرآن کی طباعت شروع ہوئی تو اس پر کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا بلکہ اسے قبول کر لیا گیا۔ یعنی شریعت طباعت سے منع نہیں کرتی تھی البتہ کچھ لوگوں نے اپنے فہم و بصیرت کی بنا پر وقتی طور پر دینی کتابوں کی طباعت کی مخالفت کی تھی۔

سلطنتِ عثمانیہ کے دور کا چھاپہ خانہ

اب رہ گیا یہ سوال کہ پرنٹنگ پریس کو اختیار نہ کر کے معاشرے میں روشن خیالی پیدا کرنے کا موقع ضائع کر دیا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ پریس ایک ذریعہ ضرور ہے لیکن وہ بجائے خود روشن خیالی کا سبب نہیں بن سکتا۔ اس کے لیے اور بہت کچھ درکار ہوتا ہے۔ اب ہمیں پریس کو استعمال کرتے ہوئے دو سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس عرصے میں ہم نے روشن خیالی کی طرف کتنا سفر طے کیا ہے؟ علم و تحقیق کے کون سے کوہ گراں سر کیے ہیں؟ جو کچھ پریس میں چھپ رہا ہے اس کی افادیت اور قدر و قیمت کیا ہے؟ دنیا بھر میں طبع ہونے والے کتب و رسائل کا بڑا حصہ نرا کچرا ہے۔ کارل پوپر اسے اشاعتی دھماکے کا نام دیتا تھا۔ طبع شدہ مواد سے لوگ جہاں علم حاصل کر رہے ہیں وہاں اپنے اپنے تعصبات اور جہالت میں رسوخ بھی پیدا کر رہے ہیں۔

بشکریہ "ہم سب" ۴ جون ۲۰۲۰ء۔۔۔https://www.humsub.com.pk/322693/sajid-ali-127/

☆☆☆

تحریر: اوم پرکاش
پنجابی سے ترجمہ: سفیر رامہ

میرا گاؤں لدھیوالہ چیمہ۔ ایک یاترا

پنجاب میں ایک کہاوت تھی کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہُوا۔ لاہور پاکستان کے حصے میں آگیا تو لوگوں کے دلوں میں لاہور دیکھنے کی تمنا اور بھی بڑھ گئی۔ 15 اگست 1947 کے بعد جالندھر میں پاکستان ہائی کمشنر کا دفتر کُھل گیا تھا۔ جہاں سے لاہور جانے کا اجازت نامہ مل جاتا تھا۔ لاہور میں ہر سال گھوڑوں کی ایک نمائش لگا کرتی تھی۔ جسے دیکھنے کے بہانے لوگ لاہور کی سیر کر آیا کرتے تھے۔
فروری ۱۹۵۶ میں پنجابی کے معروف ادیب پریم پرکاش، نیا زمانہ اخبار کے ایڈیٹر سرجن زیروی اور محرم یار نے لاہور جانے کا پروگرام

بنایا۔ میں بھی انکے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ لاہور میں ہمارے گاؤں لدھیوالہ چیمہ ضلع گوجرانوالہ کے کئی لوگ ملازمت کرتے تھے۔ میں نے اپنے اسکول کے ماسٹر محمد فیاض صاحب اور انکے چھوٹے بھائی ڈاکٹر عبدالمجید کو اپنے آنے کی اطلاع دے دی۔

ہم چاروں جالندھر سے بس کے ذریعے امرتسر گئے۔ واہگہ بارڈر پار کر کے ایک اور بس پکڑ کر لاہور جا پہنچے۔ وہاں محرم یار کا ایک دوست رہتا تھا۔ رات ہم اُس کے پاس ٹھہرے۔ دوسرے دن وہ ہمیں لاہور کی سیر کراتا ہوا چڑیا گھر کے گیٹ کے پاس لے گیا۔ وہاں پہ وہی پُرانا بورڈ لگا ہُوا تھا جس پر چڑیا گھر کے بدھ وار کو بند رہنے کی اطلاع تحریر تھی۔ میں جب ۱۹۴۴ میں اپنے رشتہ داروں کو ملنے گاؤں سے لاہور آیا تھا

تو یہی بورڈ اس جگہ لگا دیکھا تھا۔ پر اب تو یہ ہمارے لیے ایک پرایا ملک بن گیا تھا۔

چڑیا گھر کے گیٹ کے پاس ہمارے گاؤں لدھیوالہ چیمہ کا ایک شخص کھیس کی بُکل مارے کھڑا تھا۔ مجھے تو وہاں سے آئے نو سال ہو چکے تھے۔ داڑھی مونچھیں بھی نکل آئی تھیں۔ اس لیے وہ مجھے نہ پہچان سکا۔ اسکے نزدیک ہو کر میں نے اسے غور سے دیکھا تو مجھے اس کا نام یاد آ گیا۔ اور نزدیک جا کر میں نے اُس سے کہا "تمہارا نام احمد دین ہے؟ اور تم لدھیوالہ چیمہ کے رہنے والے ہو؟"۔ میں نے اسے اپنا تعارف کروایا تو اسنے بھینچ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور کہنے لگا "میں گاؤں سے صرف اس لیے لاہور آیا تھا کہ شاید ہمارے گاؤں کا کوئی باشندہ نمائش کے بہانے ہندوستان سے آیا ہو۔ مجھے یہاں آئے دو دن ہو گئے ہیں۔ تُم مل گئے ہو تو میری دلی تمنا پوری ہو گئی ہے"۔

حال احوال دریافت کرتے ہوئے جب وہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ کر میرے پِتا جی کا حال پوچھنے لگا تو اور بھی زیادہ جذباتی ہو گیا۔ میرے پِتا جی گاؤں کے اسکول میں استاد تھے اور وہ ان کا شاگرد رہ چکا تھا۔ اس نے مجھے گاؤں چلنے کا کہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ وہ گاؤں کا سیدھا سادہ ان پڑھ شخص تھا جسے قائدے اور قوانین کا کچھ علم نہیں تھا۔ میرا گاؤں جانے کو بہت دل کرتا تھا لیکن میں کوئی غیر قانونی کام کرنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کو اطلاع دے کر اسکے ساتھ ڈاکٹر عبد المجید کے گھر چلا گیا۔ جو کل سے میرے انتظار میں تھا۔ مجھے دیکھ کر اسکی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اسے مل کر مجھے احمد نگر والا مڈل اسکول یاد آ گیا۔

ڈاکٹر مجید نے تسلی کروائی کہ کوئی ایسی خطرے والی بات نہیں ہے تو میں احمد دین کے ساتھ گاؤں جانے کے لیے راضی ہو گیا۔ وہ مجھے بس

میں بٹھا کے لاہور سے گوجرانوالہ لے گیا۔ میں بِٹ بِٹ اپنے بچھڑے ہوئے شہر کو دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا کہ یہ وہی شہر ہے جہاں میں دو سال بازاروں میں پھرتا رہا ہوں۔ اور اب مجھے اس کے کسی بازار میں جانے کی اجازت نہیں۔ یہاں میرے گاؤں کے دو لڑکے اسلامیہ ہائی سکول میں، ایک خالصہ ہائی اسکول میں اور دو گورنمنٹ سکول میں پڑھتے تھے۔ میں کے جی ہندو ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہر اتوار ہم کسی ایک کے بورڈنگ ہاؤس میں اکٹھے ہو کر بڑی دیر تک گپیں لگایا کرتے تھے۔ یہ سب باتیں ایک دم میرے ذہن میں تازہ ہو گئیں۔

میں اور احمد دین گوندلانوالہ کے اڈے پر آ گئے۔ راستے میں پیٹیاں بنانے کے لیے لوہے کی چادریں وغیرہ پہلے کی طرح جگہ جگہ پڑیں تھیں۔ لوگوں کے سوا وہاں اور کچھ بھی بدلا ہوا نہیں لگتا تھا۔ ہم نے گاؤں جانے کے لیے سالم تانگہ کروایا۔ تانگے والا شریفو میرا ہم جماعت تھا۔ پر وہ مجھے نہیں پہچان سکا۔ احمد دین نے اسے میرا نام بتایا تو وہ میرے سینے سے لگ کر کہنے لگا۔ "پر کاش، تجھے یاد ہے جب میں چوتھی جماعت میں سب سے پہلے سوال حل کر کے باقیوں کو دو دو تھپڑ لگا کر سوال حل کروایا کرتا تھا؟"۔ اسی طرح ہم تینوں پرانی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے شام کو گاؤں پہنچ گئے۔ احمد دین مجھے ہمارے ہمسائے نور محمد تیلی کے گھر لے گیا۔ احمد دین نے مجھے بتایا کہ اب وہ نُور تیلی نہیں بلکہ ملک نور محمد ہے۔ اور گاؤں میں اسکی بہت ساکھ ہے۔

نور تیلی میرے پتا جی کا ہم عمر تھا۔ ہمارا ہمسایہ اور پتا جی کا دوست تھا۔ ہماری ایک دوسرے کے گھروں سے آٹا لینے تک کی سانجھ تھی۔ جب اُسنے اپنے دونوں بیٹوں سردار احمد اور مختار احمد کی سُنتیں کیں تو ہمارے گھر سُوکھا راشن بھجوایا۔ میری بے بے سردار احمد کی دادی کو مبارکباد دینے اُن کے گھر گئی۔ ۲۶\۲۷ ستمبر ۱۹۴۷ کو جب ہمارے گاؤں میں فساد ہوئے تو نور محمد رات کے اندھیرے میں ہمارے گھر آ کر
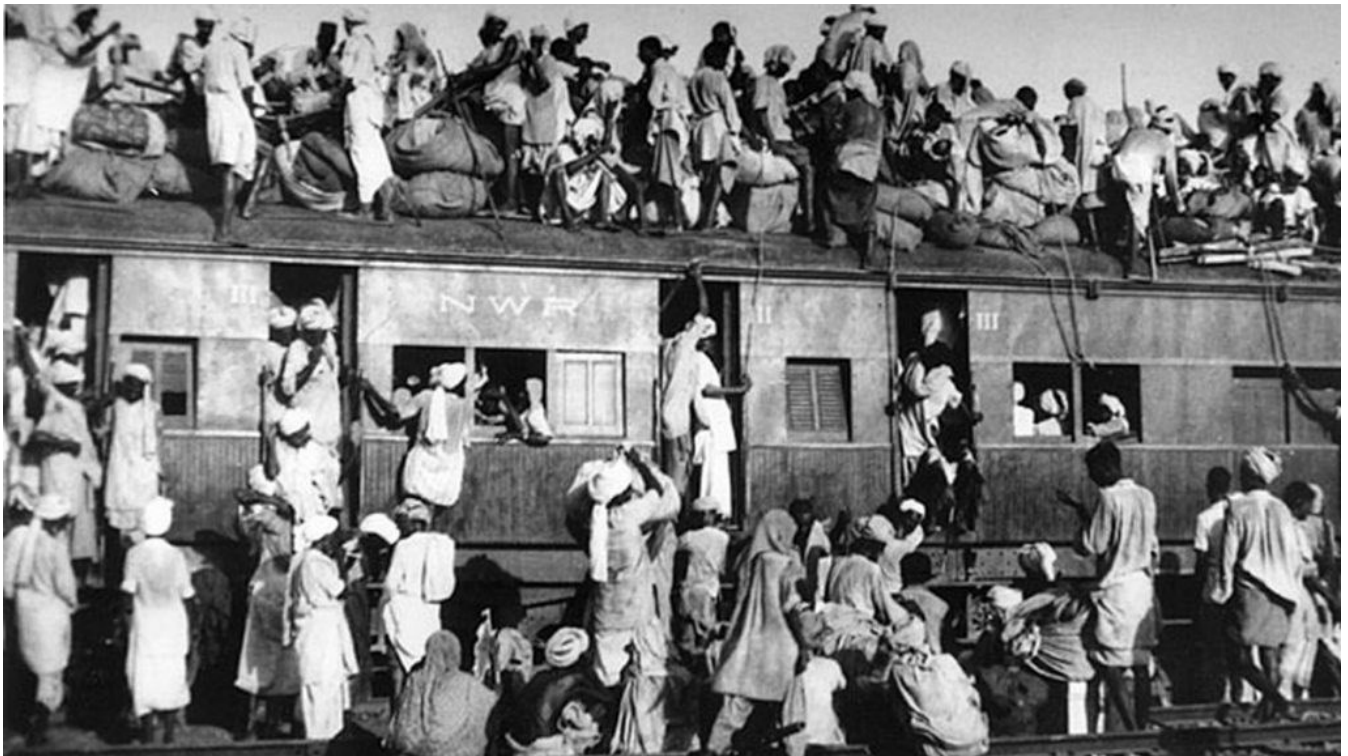
پتاجی اور داداجی کو باخبر کر گیا تھا۔ حاکم محمد ہنجراء ہمارے سب گھر والوں کو اپنی پناہ میں لے گیا تھا۔ پھر بھی میرے داداپنڈت مولراج کا قتل ہو گیا۔

میں ابھی ملک نور محمد کے گھر جا کر بیٹھا ہی تھا کہ وہاں لوگوں کی بے پناہ بھیڑ اکٹھی ہو گئی۔ صحن میں کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہ رہی۔ بہت سے لوگ باہر گلی میں کھڑے تھے۔ میں انہیں ملنے کے لیے گھر سے باہر آ گیا۔ ہر کوئی اپنے دوستوں اور ساتھیوں کا حال احوال جاننے کے لیے بیتاب تھا۔ ساری رات باتوں میں گذر گئی۔ ان سب کو اس بات پہ بہت حیرانی تھی کہ ہم بھارت جا کر کس طرح آباد ہوئے۔ اور کس طرح نئے سرے سے کام کاج شروع کر کے اپنے پیروں پہ کھڑے ہو گئے۔

صبح اُٹھ کر میں شہتوت والے کنویں پر نہانے کے لیے گیا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں اپنے سسرال گیا ہوا تھا اور اب واپس اپنے گاؤں لوٹا ہوں۔ ہمارے گاؤں کے مشرق میں ایک بہت صاف ستھرا بازار تھا۔ اب اسکے بیچ میں ایک گندی نالی بہہ رہی تھی جس سے بدبو اُٹھ رہی تھی۔

میں جس گھر کے سامنے سے گذرتا، عورتیں گھر سے باہر نکل کر دروازے پر کھڑی ہو جاتیں۔ ان میں سے مہاجر عورتوں کو چھوڑ کر میں باقی سب کو پہچانتا تھا۔ ان میں سے کچھ کے میں نے پاؤں چھوئے اور ان سے دعائیں لیں۔ ایک نے کہا۔ "یہ ابھی چھوٹا ہی تھا کہ اسکی ماں سہاگ ونتی فوت ہو گئی"۔ دوسری پاس سے بولی۔ "اسکا باپ منشی بہت ہی اچھا انسان تھا"۔ اپنی بے بے کا ذکر سُن کر میرا گلا بھر آیا۔ ایک گھر کے اندر میں گیا تو رحمت علی کی ماں دودھ کا پیالہ لے آئی۔ میں نے لے تو لیا لیکن ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ زیادہ کھا پی کر کہیں بیمار نہ پڑ جاؤں۔ میں جس گھر میں بھی جاتا لوگ مجھے زبردستی کچھ نہ کچھ کھلا دیتے۔ میں ہاتھ جوڑ کر کھانے سے انکار کرنے کی کوشش کرتا لیکن جانے کہاں سے اُنکے دلوں میں پیار کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ سب کو ۱۹۴۷ کے فسادات بھول چکے تھے۔ ساری نفرت مٹ چکی تھی۔

جب میں اپنے گھر میں داخل ہوا اسوقت میری جو حالت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ میرے ذہن میں اپنے پیدا ہونے سے لیکر اس گھر کے ستمبر ۱۹۴۷ میں لُٹ جانے تک کی ساری فلم چل رہی تھی۔ اُس دن گاؤں میں قتلِ عام ہوا تھا۔ جس میں میرا دادا بھی مارا گیا تھا۔ میری بے بے جس جگہ بیٹھ کر چرخہ کاتتی تھی، جس جگہ چولہے پر اور تندور میں روٹیاں پکاتی تھی، جس چونکے پر میرا دادا بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا اور لوگوں کے مسائل سنتا تھا وہ سب اب ایک خواب لگ رہا تھا۔ صحن میں کسی ہندو کے گھر سے لوٹی ہوئی لوہے کی ایک بڑی پیٹی پڑی تھی۔ جس میں گھس کر ایک بکری پٹھے کھا رہی تھی۔ جب ہمارا گھر لوٹا گیا تھا تو کوئی شخص نلکے کا ہیڈ اُتار کر لے گیا تھا۔ گھر میں رہنے والوں نے نل کے منہ پر ایک چیتھڑا لپیٹا ہوا تھا۔ وہ نو سالوں میں نلکے کا نیا ہیڈ بھی نہیں لگوا سکے تھے۔ چھت پر چڑھ کر دیکھا تو چبارے کی دیوار میں دراڑ آ گئی ہوئی تھی اور چبارے کو تالہ لگا ہوا تھا۔

مجھے گاؤں والوں نے تین دن روکے رکھا۔ جب میں نے اُن کے ساتھ بیٹھ کر گوشت اور انڈے کھائے تو وہ بہت حیران ہوئے۔ بار بار پوچھتے تھے کہ تم میں یہ تبدیلی کیسے آ گئی؟ تُم لوگ ہمارے ہاتھ کا پکا کھانا تو دور کی بات ہے ہمارے ساتھ بیٹھ کر بھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔

ایک دن گاؤں کے چند عیسائی آکر مجھے اپنے گھروں میں لے گئے۔ جب میں وہاں گیا تو سب اپنے اپنے مالکوں کا حال احوال پوچھتے رہے۔ کسی نے مجھے کھانے پینے کا نہ پوچھا۔ انہیں پتہ تھا کہ ہندو تو انکے نزدیک آنے کے بھی روادار نہیں تھے۔ اس لیے اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی پنڈت انکے گھر سے کچھ کھائے۔ مجھے انکے گھروں میں بیٹھنا عجیب سا لگا۔ جس گھر کی مالکن ہمارے گھر کی صفائی کرتی تھی اسے میرے دادا نے ایک بھینس اُدھار دی ہوئی تھی۔ جسے دیکھنے وہ کبھی کبھار آتا تو میں بھی اسکے پیچھے چل پڑتا۔ وہ مجھے دیکھ لیتا تو ناراض ہوتا کہ میں اس جگہ اسکے پیچھے کیوں آیا تھا۔

تین چار عورتوں نے شگن کے طور پر میری بہن درشنا کے لیے مجھے کچھ روپے دیے۔ وہ درشنا کے بیاہ کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ میں نے بتایا کہ جالندھر میں ایک جگہ اسکی بات چل رہی ہے۔ لڑکے والے پیچھے سے گجرات کے ہیں۔ میری یہ بات سُن کر ان سب نے کہا۔ ”اوئے پرکاش۔ گجرات کے لوگ تو اچھے نہیں ہوتے۔ آپ لوگ بیٹی کو کہاں دھکا دینے لگے ہیں۔ لڑکی کا رشتہ سیالکوٹ، شیخوپورہ یا گوجرانوالہ ضلعوں میں کہیں طے کریں۔ ہماری طرف سے جا کے اپنے پتا کو سمجھانا۔ لڑکی بیچاری پہلے ہی بغیر ماں کے ہے“۔ یہی بات مجھے جالندھر میں بھی کچھ لوگوں نے کہی تھی۔

شام کو ایک شخص میرے پاس آکر مجھ سے پوچھنے لگا کہ منشی تیرتھ رام جانے سے پہلے سب کے زیور واپس کر گئے تھے۔ ہم لوگ ان دنوں میں یہاں نہیں تھے اس لیے ہمیں اپنے کانٹے واپس نہیں مل سکے۔ میں نے اسے بتایا کہ ان کا زیور پتا جی نے منشی فیاض کو دے دیا تھا۔ ان سے جا کر پتہ کرلیں۔ میرے دوست سردار احمد کی پھپھی سردار بی بی پنے گاؤں احمد نگر آئی ہوئی تھی۔ بچپن میں ہم بھی اسے پھپھی کہا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے اپنی سہیلیوں کے بارے میں پوچھتے ہوئے رونے لگی۔ احمد نگر سے ماسٹر حیات محمد میرے بارے میں سن کر اسے مجھ سے ملوانے کے لیے لدھیوالے لے آیا تھا۔ جب میں احمد نگر پڑھتا تھا تو ماسٹر حیات محمد ہمارے گھر سے میرا کھانا لاتا تھا۔ وہ میرے پتا جی کے ساتھ ہمارے گاؤں کے اسکول میں ٹیچر تھا۔ وہ بڑی محبت سے مجھے ملا۔ بار بار پوچھتا تھا پنڈت جی کا کیا حال ہے۔ یار وہ تو بہت ہی اچھا بندہ تھا۔ شام تک میرے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ جاتی دفعہ شگن کے طور پر مجھے کچھ رقم دے گیا۔

گاؤں کا مندر اسی طرح قائم تھا۔ لیکن دھرم سالہ میں کچھ لوگوں نے اپنا گھر بسا لیا تھا۔ ہمارے ٹھاکر دوارے کو بھی پناہ گیروں نے کئی حصوں میں بانٹ رکھا تھا۔ وڈو مراثی جس نے پرکاش سنگھ کو اپنے گھر میں چھپا کر اسکی جان بچائی تھی وہ اسکا حال پوچھتے ہوئے بہت جذباتی ہو گیا۔

پاکستان کا مشہور شاعر منیر نیازی ایک بار بھارت پاکستان مشاعرے کے سلسلے میں جالندھر آیا تھا۔ اسنے اس مشاعرے میں ایک نظم پڑھی تھی جس کا لب لباب یہ تھا کہ ہم اپنے ہی دیس میں اجنبیوں کی طرح آئے ہیں۔ اپنے گاؤں لدھیوالے میں آکر میں بھی یہی محسوس کر رہا تھا۔

جب پنجاب تقسیم ہوا تھا تو دونوں پنجابوں کے لوگ سرحد پر جا کر ملاقاتیں کر لیا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے گذرے وقت کی

باتیں کر کے واپس لوٹ جاتے۔ کچھ عرصہ بعد ملاقاتوں کا یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

میں جب گاؤں سے چلنے لگا تو آٹھ دس لوگ مجھے الوداع کرنے ساتھ آئے۔ احمد دین کے ساتھ جب میں گوجرانوالہ کے بس اسٹینڈ پر پہنچا تو ماسٹر محمد فیاض نے ہمیں دیکھ کر ماسٹروں والے لہجے میں زور سے آواز دی۔ ''اوئے بے حیاؤ، ٹھہر جاؤ''۔ ہم دونوں نے ان کے پاؤں کو ہاتھ لگا کر سلام کیا۔ انہوں نے میرا ماتھا چوم لیا اور دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ کر مجھے دیکھتے رہے۔ انکے ساتھ انکا سب سے چھوٹا بیٹا اعجاز احمد تھا جو 1947 میں میرے پتاجی کے اسکول میں پہلی جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ کہنے لگے۔ ''میں تمہاری تلاش میں لاہور مجید کے گھر گیا تھا لیکن تم وہاں سے اپنے گاؤں جا چکے تھے۔ وہیں پر تمہارا انتظار کرنے کے بعد آج ہی واپس لوٹا ہوں''۔ ہم ایک دوکان پر بیٹھ کر بڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ وہ پتاجی کی سروس اور میرے چھوٹے بہن بھائیوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ جاتے وقت انہوں نے مجھے شگن دیا۔ لاہور آ کر مجھے پتہ چلا کہ میرے ساتھ آنے والے دوست میرا انتظار کر کے واپس جالندھر جا چکے ہیں۔ میں وہاں سے ایک درجن مالٹے اور اختر شیرانی کی شاعری کی ایک کتاب خرید کر واپس بھارت آ گیا۔

گھر آ کر میں نے اپنے پتاجی کو بتایا کہ میں تین راتیں اپنے گاؤں میں گذار کر آیا ہوں تو وہ حیرانی سے گاؤں کے ایک ایک شخص کا حال پوچھنے لگے۔ اپنے گھر اور ٹھاکر دوارے کا حال پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ چبارے کی ایک دیوار میں دراڑ پڑ گئی ہے۔ یہ سن کر جیسے انہیں صدمہ پہنچا۔ کہنے لگے ''وہ چبارا تو میں نے اپنے ہاتھوں سے منگل سنگھ مستری سے بنوایا تھا۔ اس میں دراڑ کیسے پڑ گئی؟''

یہ بات انہوں نے کئی بار بڑے افسوس سے کی۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ ''دراڑ پڑ گئی ہے تو پھر کیا ہوا۔ ہم نے کون سا اب اس مکان میں جا کر رہنا ہے۔ چھوڑیں اس بات کو۔'' میرا یہ روکھا سا جواب سُن کر وہ اور بھی زیادہ دُکھی ہو گئے۔

☆☆☆
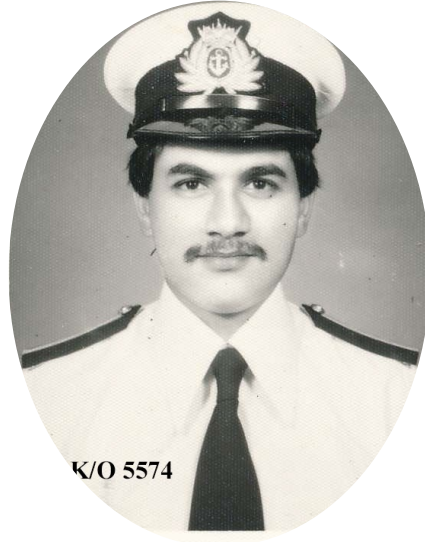
سجاد احمد۔ گوٹن برگ سویڈن

البتروس اور العلیم۔۔۔ایک یادگار رفاقت

60ء کی دہائی میں مَیں اپنی سمندر کی زندگی کا آغاز خلیج بنگال (مشرقی پاکستان) میں اپنے ماموں جان کے ہمراہ کر چکا تھا۔ وہ سندر بن

پائلٹ تھے اور میں اکثر ہی انکے ہمراہ رہتا۔ پھر سکول کا دور مکمل ہوا تو خاکسار نے 1976ء سے باقاعدہ سمندری نوکری کی ٹریننگ کا آغاز کیا۔ اس ٹریننگ کے دور کے آخری برس 1983ء میں میری تعیناتی بحری جہاز العلیم پر ہوئی۔ یہ دیو قامت بحری جہاز جسکی لمبائی 248 میٹر تھی اسی برس برازیل کے شہر Angra dos Reis (بادشاہوں کا شہر) کے ایک شپ یارڈ میں تیار کیا گیا تھا۔ خدا کے ناموں میں سے ایک پر اس بحری جہاز کا نام منتخب کرنا مصطفیٰ گوکل صاحب کا پرانا وتیرا تھا۔ بنیادی طور پر پاکستان سے تعلق رکھنے والے یہ تین رئیس تاجر بھائی نسبتاً گمنامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس سے قبل وہ 119 جہازوں کے نام بھی اسی طرح رکھ چکے تھے۔ اس سارے بحری بیڑے کو وہ ہانگ کانگ بیٹھ کر کنٹرول کرتے تھے۔

العلیم کو میں نے ہانگ کانگ سے جائن کیا اور وہاں سے ہمیں حکم ملا کہ ہم آسٹریلیا کے مشرق میں واقع بندرگاہ Gladstone پہنچیں تاکہ وہاں سے ایک لاکھ ٹن کوئلہ لادا جائے اور پھر اسے لے کر ہمیں بحر الکاہل، بحر الاوقیانوس اور بحیرہ روم سے ہوتے ہوئے اٹلی پہنچانا تھا۔ دنیا کے سب سے چھوٹے براعظم کے مشرق میں دنیا کا سب سے بڑا ساحلی سنگستان یعنی Great Barrier Reef واقع ہے۔ یہ سنگستان دراصل ساحلی مرجان Coral Reef ہے اور اس کا شمار دنیا کے ساتویں عجوبہ میں ہوتا ہے اور یہ اتنی بڑی ہے کہ اسے خلاء سے بھی باآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سنگستان میں سے بحری جہاز کو گزارنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ اس کا اندازہ اس میں سے گزرنے کے بعد باآسانی لگایا جا سکتا ہے کیونکہ یہاں حد نظر تک غرق شدہ جہاز دکھائی دیتے ہیں جیسے یہ کوئی "بحری جہازوں کا قبرستان" ہو۔ لہٰذا جہاز کے اس سنگستان میں داخل ہونے کے لئے ایک پائلٹ یعنی "رہنمائی کرنے والا" لازم ہوتا ہے۔ آسٹریلیا کے شمال مشرق میں واقع (آبنائے ٹارس)

El Aalim ELDI-2
Length 242 meters
Breadth 35 meters
Deadweight 75 485 tonnes
Engine M.A.N. K8 SZ

Torres Strait پہنچنے پر ہم نے Reef-Pilot کو العلیم پر سوار کیا اور گلیڈ سٹون کی بندر گاہ کی جانب خراماں خراماں چل پڑے۔ جہاز کے دائیں بائیں حد نظر سمندر ہی سمندر دکھائی دیتا تھا مگر یہ محض ایک سراب کی کیفیت تھی کیونکہ اس حد نظر سمندر کی گہرائی چپہ چپہ پر اچانک محض دو یا تین میٹر تک رہ جاتی ہے اور اسی وجہ سے پرانے وقتوں میں کئی بحری جہاز اس سنگستان میں غرق ہو جایا کرتے تھے۔ تقریباً چوبیس گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم گلیڈ سٹون پہنچے تو بندر گاہ میں کوئلہ تیار پڑا تھا۔ برقی رفتار سے چند گھنٹے میں ایک لاکھ ٹن کوئلہ العلیم پر لاد دیا گیا۔ اسی دوران وہاں موجود Stella Maris کی تنظیم تیزی سے حرکت میں آئی اور ہم سب کو اپنے دفتر میں چائے کی دعوت دی جہاں یہ لوگ رضا کارانہ طور پر ملاحوں کی خدمت کیلئے ڈاک ٹکٹ، کرنسی کی تبدیلی، ٹیلیفون اور اسی طرح کی دوسری سہولیات فراہم کرتے ہیں۔ رومن کیتھولک تنظیم Stella Maris پوپ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے دنیا بھر میں ملاحوں کی بڑی خدمت کرتی ہے۔ ہم نے انکی خدمت میں بہت خلوص اور انسانیت سے محبت پائی۔ Stella Maris Liberary سے خاکسار نے ایک کتاب بھی حاصل کی تا کہ اس لمبے سفر میں پڑھنے

کیلئے کچھ پاس ہو۔لائبریرین کی ہدایت تھی کہ جب اٹلی پہنچوں تو وہاں کی Stella Maris کو یہ کتاب واپس کردوں اور یوں اس تنظیم نے ملاحوں کیلئے ایک "سمندری لائبریری" بھی ممکن بنائی۔

اگلے روز علی الصبح ہم کوئلہ لادنے کے بعد مشرق کی سمت دنیا کے سب سے بڑے سمندر بحر الکاہل میں منزل مقصود کی طرف نکل پڑے۔ آسٹریلیا سے مشرقی سمت میں بحر الکاہل میں بے شمار جزائر ہیں اور ان کے درمیان سے ہوتے ہوئے ہم تقریباً بیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے محو سفر ہوئے۔ مَیں جہاز کے برطانوی چیف افسر Brown کے ساتھ صبح 4 سے 8 کی ڈیوٹی کر رہا تھا کہ میری نظر دو البتروسوں (آبی پرندوں) پر پڑی جو گلیڈسٹون کی بندرگاہ سے نکلتے ہی ہمارے ساتھ ساتھ ہو لیے تھے۔ پرانے وقتوں میں جب البتروس Albatross کسی جہاز کے پیچھے ہو لیتے تھے تو ملاح لوگ اسے بڑی خوش قسمتی سے تعبیر دیتے تھے اور انکا خاص خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ خاکسار نے اس روز صبح کی Logbook میں تحریر کر دیا کہ دو Albatross ہمارے ہمراہ ہیں۔ العلیم کی رفتار تقریباً 20 کلومیٹر فی گھنٹہ تھی اور اس حساب سے بحر الکاہل کے ایک کنارے سے دوسرے کی مسافت (11524 کلومیٹر تھی) اور یہ سفر تقریباً 25 دن کا بنتا تھا۔ سمندر میں بحری جہاز کی یہ رفتار بہت معقول سمجھی جاتی ہے کیونکہ جہاز میں ایک لاکھ ٹن کوئلہ بھی لدا ہوا تھا۔

جب ہم آسٹریلیا کے ساحل سے تقریباً ایک ہزار کلومیٹر کھلے سمندر میں جا پہنچے تو میں نے دیکھا کہ دونوں پرندے بدستور جہاز کے ساتھ ہیں۔ اس پر میں نے العلیم کے چیف cook کو انکے بارے بتایا اور انکے کھانے پینے کا خیال رکھنے کو کہا۔ تقریباً بارہ ایام کے مسلسل سفر کے بعد العلیم بحر الکاہل کے درمیان میں پہنچ چکا تھا اور موسم خرابی کی طرف مائل تھا۔ بڑی بڑی لہریں جہاز کے عرشہ پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتیں اور ہوا کے جھکڑ چلنا شروع ہو گئے تھے۔ دیو قامت العلیم جہاز مال سے لدا ہوا تھا اور اپنے وزن کی وجہ سے آہستہ آہستہ جھٹکے کھاتا اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ ایک روز صبح چار بجے اچانک کپتان جہاز کے دیدبان (bridge) پر آ گیا۔ یہ کوئی معمول کی بات نہ تھی کیونکہ کپتان عموماً ڈیوٹی پر موجود افسر کی درخواست ہی پر دیدبان میں آتے ہیں۔ چیف افسر brown نے کپتان نارمن سے خیریت دریافت کی اور گرم گرم کافی پیش کی۔ کافی کے گھونٹ بھرتے کپتان مجھ سے مخاطب ہوا اور پوچھنے لگا کہ پرندے کہاں ہیں۔ دیدبان کا دروازہ کھول کر میں کپتان نارمن کو باہر لے گیا اور پرندے دکھائے۔ دونوں البتروس اس وقت بڑی بڑی سمندر کی موجوں کے بیچ خالی جگہوں (حضیض بحر) میں اپنے لمبے لمبے طاقتور بازوؤں wings کے ساتھ محو پرواز تھے۔ دونوں پرندے گھنٹوں بغیر اپنے پروں کو جنبش دیئے طوفانی ہوائی لہروں میں با آسانی پرواز کر رہے تھے۔ یہ پرندے دراصل dynamic soaring کی تکنیک کے ذریعہ پرواز کرتے ہیں جس میں یہ ہوا کی لہروں کی رفتار کی مدد سے اپنی پرواز کو قائم رکھتے ہیں۔ عام پرندے اپنی پرواز کو پروں کی جنبش سے ہی قائم رکھ سکتے ہیں جبکہ البتروس ایسا نہیں کرتے۔ دیکھنے میں انتہائی دلفریب البتروس کا سینہ سفید اور پشت سیاہ رنگ کی تھی۔ انکی چونچیں تقریباً 20 سینٹی میٹر لمبی ہوتی ہیں۔ انکی چونچ میں ہی نظام قدرت کے تحت ازالہ نمک یعنی desalination plant نصب کیا ہوا ہے۔ جونہی یہ سمندر کا انتہائی نمکین پانی پیتے ہیں چونچ کے اندر ہی پانی میں سے نمک الگ ہو جاتا ہے اور بعد ازاں میٹھا پانی حلق سے نیچے اترتا ہے۔ ہے کوئی جو ربّ کی قدرتوں کا احاطہ کر سکے؟

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ Albatross کے مضبوط "پر" دراصل صرف دکھائی دینے میں مضبوط ہوتے ہیں جنکی مدد سے وہ صرف (بے موٹر طیارے کی طرح) gliding کر سکتے ہیں اور جنکو اپنی پرواز کیلئے تیز ہوا کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی ایک بے موٹر طیارے کو ہوتی ہے۔ اگر کبھی سمندر میں اچانک ہوا رک جائے تو یہ پرندے زیادہ دیر ہوا میں نہیں رہ سکتے اور پانی کی سطح پر بیٹھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب تک دوبارہ ہوا تیز نہ ہو یہ پرواز نہیں کر سکتے۔ البتروس رات کی تاریکی میں کھانا پینا پسند کرتے ہیں کیونکہ انکی من پسند غذا سمندر مچھلیوں کے علاوہ squids یعنی "قیر ماحی" ہیں۔ یہ مچھلی کی قسم رات کی تاریکی میں سمندر کی سطح پر نمودار ہو کر چمکتی ہے تو البتروس ان پر جھپٹتے ہیں۔ کپتان نارمن کو یہ نظارہ بہت پسند آیا۔ کچھ دیر دیدبان سے باہر ہمیں ٹھنڈ لگی تو ہم دونوں واپس bridge کے اندر آ گئے۔ چیف افسر اور کپتان دونوں ان پرندوں پر اظہار خیال میں مصروف ہو گئے۔ میں جہاز کو گھمانے والی چرخی (steering) پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کپتان اور چیف افسر بھی میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ کپتان مجھ سے مخاطب ہوا اور پوچھنے لگا کہ آخر مصطفٰی گوکل کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا کہ اس نے العلیم جیسے بڑے بڑے جہاز خریدنے شروع کر دیے۔ میرے خاموش رہنے اور عدم دلچسپی پر کپتان نے مضمون تبدیل کیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ اس جہاز پر عام چرخی (steering) کے علاوہ بھی ایک متبادل نظام موجود ہے تاکہ اگر steering اچانک خراب ہو جائے تو متبادل نظام کو استعمال کر کے جہاز کو کنٹرول کیا جا سکے اور ساتھ ہی مجھے ہدایت دی کہ میں جہاز کو خودکار نظام (automatic pilot) سے ہٹا کر دوسرے سسٹم پر منتقل کر دوں۔ جب میں نے ایسا کر دیا تو کپتان نے خود متبادل سسٹم کا جائزہ لینا شروع کر دیا اور جہاز کو دائیں بائیں موڑا۔ اس وقت ہر جانب سینکڑوں میل تک کوئی دوسرا جہاز موجود نہ تھا اور نہ ہی زمین قریب تھی۔ کپتان ہر خطرہ سے بے فکر ہو کر اب متبادل steering system کو استعمال کر کے جہاز کو چکر دے رہا تھا کہ اچانک اس نے چیف افسر کو اپنے پاس آنے کو کہا۔ میں نے دیکھا کہ جہاز اب گول گول چکروں میں گھومتا جا رہا تھا۔ کچھ منٹ گزرے مگر دیو قامت جہاز مسلسل دائروں میں چکر لگا رہا تھا۔ کپتان اور چیف افسر دونوں اس صورت حال میں اب کچھ پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ سورج طلوع ہو چکا تھا اور دن کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ جہاز اب کپتان یا چیف افسر کے کنٹرول میں نہیں۔ اس پر کپتان نے جہاز کے انجن بند کروا دیئے اور ہم بحر الکاہل کے عین بیچ شدید طوفانی لہروں میں خاموش ہو کر کھڑے ہو گئے۔ تمام جہازوں اور یہاں تک کہ چھوٹی کشتیوں کے hull (جہاز کا جسم) کی یہ خصوصیت ہے کہ جونہی انکی حرکت کا نظام بند ہو جائے یہ سب اپنے لمبے رخ کو لہروں اور طوفانی ہواؤں کے برخلاف لے آتے ہیں اور جب بڑی بڑی موجیں جہاز کے اطراف سے ٹکراتی ہیں تو پھر یہ بڑے خوفناک ہچکولے کھانے (rolling) شروع کر دیتے ہیں۔ العلیم بھی اب اس ہی خوفناک صورت حال سے دوچار تھا۔ جہاز کے انجینئروں کا عملہ سر جوڑ کر اب فنی مسئلہ کے حل پر لگ گیا۔ ایک پورا دن اور پھر آنے والی پوری رات گزر گئی۔ اگلے روز صبح کے وقت انجینئروں کی رات بھر کی کاوشوں کے نتیجہ میں فنی نقص دور کر دیا گیا اور العلیم کے انجن دوبارہ چالو کر دیے گئے۔ چوبیس گھنٹے کھڑے رہنے پر ہمارے سفر میں ایک دن کا مزید اضافہ ہو گیا۔ ایک دن گزر جانے کے بعد جب دوبارہ میری ڈیوٹی صبح 4 سے 8 کا موقع آیا تو میں نے دیکھا کہ دونوں پرندے دور دور تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ خیال آیا کہ شاید وہ واپس آسٹریلیا لوٹ گئے ہوں گے۔ العلیم بڑی بڑی موجوں اور طوفانی

ہواؤں کو چیرتا ہوا اپنی منزل مقصود کی جانب رواں دواں تھا۔ دو دن گزر گئے تو اپنی ڈیوٹی کے موقع پر میں نے دوربین اٹھائی اور دیکھا کہ دونوں البتروس اونچی اونچی موجوں کے درمیان ''سیر سپاٹا'' کر رہے ہیں۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی اور میں نے فوری فریج سے ایک پوری ڈبل روٹی نکال کر انکی جانب سمندر میں پھینکی اور خوب سیٹیاں بجائیں۔ صبح 8 بجے کے قریب میں نے چیف افسر کی اجازت سے جہاز کے (نظام خطاب عامہ) public address system پر اعلان کیا کہ دونوں پرندے اب دوبارہ العلیم کے ساتھ ہیں۔ جب ڈیوٹی ختم کر کے ناشتہ کی غرض سے طعام گاہ (mess) پہنچا تو سب نے البتروسوں کے بارے میں مجھ سے دریافت کیا۔ ہم سب نے ملکر دونوں پرندوں کو نام دیئے ۔ ایک کا نام Spark اور دوسرے کا نام Chippy تجویز پایا۔ بحر الکاہل کے باقی ماندہ سفر میں سب روزانہ صبح spark & chippy کو سیٹیاں بجا کر جہاز کی طرف بلاتے اور پھر ڈبل روٹی کے ٹکڑے انکی جانب پھینکتے۔ غروب آفتاب کے بعد میں شام کے وقت دیکھتا کہ دونوں پرندے جہاز کے عقب میں ایک اونچی کرین کے اوپر استراحت کی غرض سے بیٹھ جاتے۔ ہم انھیں وہیں کھانا دے دیتے۔ سفر کا اب بائیسواں روز چل رہا تھا اور ہم بحر الکاہل کے دوسرے کنارے سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ کنارہ اب جہاز کے ریڈار کی سکرین پر واضح طور پر نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔ یہ براعظم جنوبی امریکہ کا علاقہ Tierra del Fuego تھا جسے انگریزی میں (The land of fire) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان علاقوں کے سارے نام پرانے وقتوں کے ملاحوں نے رکھے ہوئے ہیں جو اپنے اپنے دور میں بحری جہازوں کے ذریعہ دنیا کی دریافت پر نکلے اور بڑی شہرت حاصل کی۔ جب ہم Tierra del Fuego سے تقریباً بیس کلومیٹر فاصلہ تک پہنچ گئے تو دونوں پرندے العلیم کو پیچھے چھوڑ کر زمین کی جانب چلے گئے اور یوں یہ 25 روزہ رفاقت اپنے اختتام کو پہنچی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یقیناً یہ دونوں پرندوں کا پہلا یا آخری سفر نہ تھا۔ جدید جہاز رانی کے طریقوں اور آلات سے لیس العلیم بحر الکاہل کو عبور کرنے کی غرض سے مختصر ترین راستے پر سفر کر کے پہنچا اور یہی راستہ دونوں پرندوں Spark & Chippy نے بھی اپنایا۔ بیچ میں فنی خرابی کی وجہ سے العلیم 24 گھنٹہ تک کھڑا بھی رہا مگر ان پرندوں نے جہاز کا ساتھ نہ چھوڑا اور عین اسی راستہ پر گامزن رہے جو جدید ترین جہاز رانی کے آلات تجویز کر رہے تھے۔ سمندر میں قدرت کی شان کے نظارے بڑے انوکھے ہوتے ہیں۔ بظاہر نازک اندام پرندے طوفانی ہواؤں اور موجوں میں روز ازل سے اسی طرح بڑے بڑے سمندروں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ یہ محض اللہ تعالیٰ ہی کے انتظامات ہیں کہ اس نے ہر چرند و پرند کو زمین میں مختلف خطوں میں پیدا کیا اور پھر ان کو وہ خصوصیات بھی عطا کیں تا کہ یہ سب ان خطوں کی ہر قسم کی سختیاں برداشت کر سکیں۔ 11524 کلو میٹر کا فاصلہ ان پرندوں نے ہمارے ہمراہ طے کیا اور انھیں اپنے ساتھ ساتھ دیکھ کر ہمیں بہت حوصلہ اور تسلی و تسکین میسر آئی۔ دونوں البتروسوں کے پاس رب کی طرف سے اتنے طویل سفر کے راستہ کا تعین کرنے کیلئے یقیناً کوئی جدید نظام ضرور تھا جو ہمارے پاس جدید ترین آلات navigation سے بھی زیادہ ایڈوانس اور موثر تھا۔ جب جہاز فنی خرابی کی وجہ سے کھڑا ہو گیا تو Spark اور Chippy نے بھی بھانپ لیا کہ العلیم کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے اور وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ فنی خرابی دور کر لینے کے بعد جب ہم نے دوبارہ اپنا سفر شروع کیا تو دونوں البتروس ایک مرتبہ پھر العلیم کے ساتھ ہو لیے۔ دونوں کو علم تھا کہ العلیم درست راستہ پر گامزن ہے اور انھیں دیکھ کر ہمیں بھی یقین ہو گیا کہ ہم بھی درست راستے پر گامزن

ہیں۔ پرانے وقتوں میں بھی ملاح اپنے غیر جدید جہازوں اور بغیر جدید آلات navigation کے ان پرندوں سے مدد لیتے تھے اور آج بھی انکا ساتھ ہمارے لئے باعث رہنمائی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کردہ اشرف المخلوق کی مدد اور رہنمائی کیلئے زندگی کے دسترخوان پر کیا کیا نہیں سجا رکھا۔ اسکی نعمتوں کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔ پرندوں کا ساتھ چھوٹا اور ہم جہاز کو لے کر Cape Horn کے جنوب سے گزرتے ہوئے بحر اوقیانوس میں داخل ہوئے اور شمال کی سمت برازیل کے ساحلی علاقے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے آخر اس سمندر کو پار کرنے کیلئے یورپ کی سمت مڑ گئے۔ تقریباً پندرہ ایام بعد ہم بحرہ روم کے داخلی دروازے " جبل الطارق " پہنچے اور اسے پار کرنے کے بعد بحرہ روم میں اٹلی کی بندرگاہ Piambino تک پہنچے۔ اور یوں آسٹریلیا سے تین سمندر پار کرکے 45 روز کی مسلسل مسافت کے بعد ہمارا سفر اختتام پذیر ہوا۔

☆☆☆
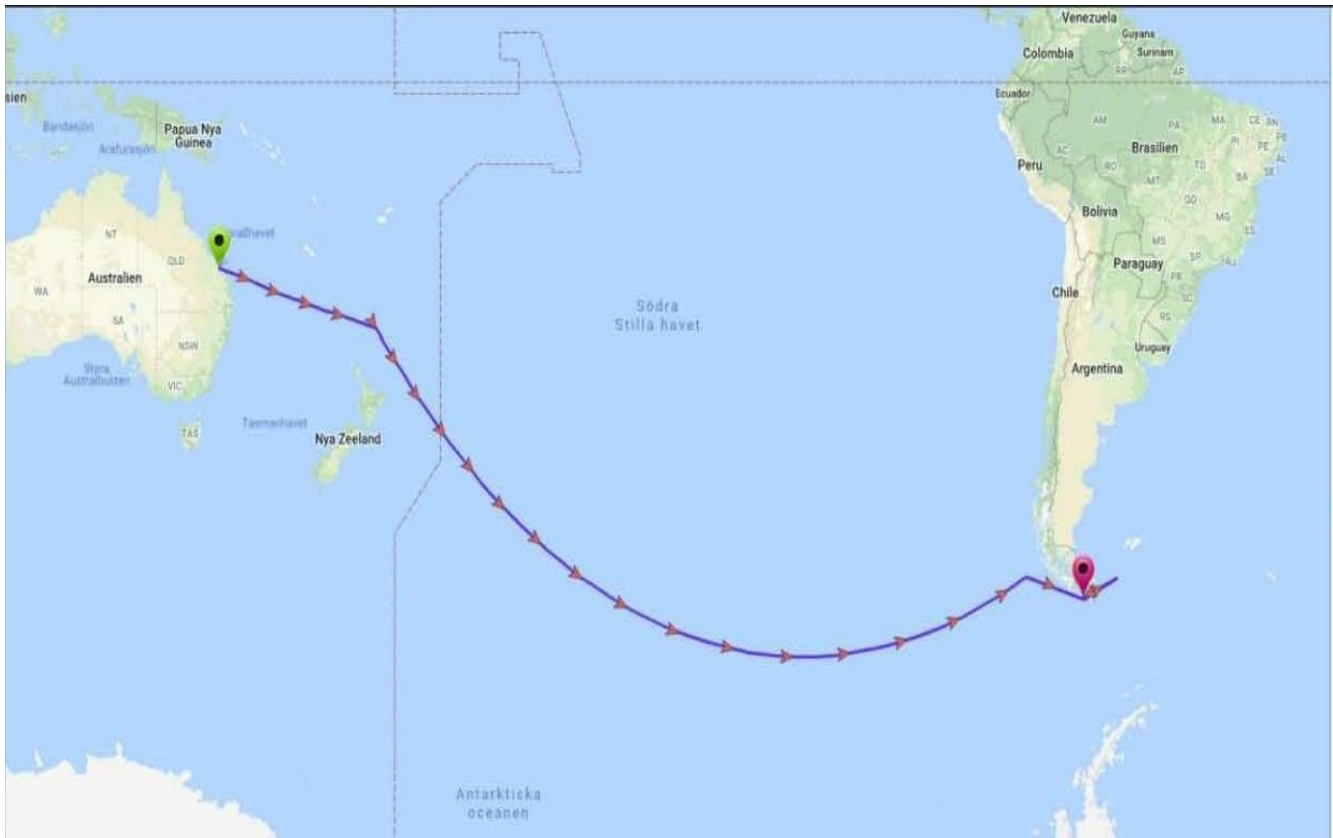
عقیل عباس جعفری

ریڈیو پاکستان کا اعلانِ آزادی۔۔۔اصل حقائق کیا ہیں

چند روز سے یوٹیوب اور سوشل میڈیا پر ایک ویڈیو کی دھوم مچی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ریڈیو پاکستان کا قیام 13 اور 14 اگست 1947ء کی درمیانی رات کو عمل میں آیا۔ اس ویڈیو میں ریڈیو پاکستان کے نامور اناونسر مصطفیٰ علی ہمدانی کی ایک ریکارڈنگ سنوائی گئی ہے جس میں وہ اعلان کرتے ہیں کہ "السلام علیکم۔ پاکستان براڈکاسٹنگ سروس۔ ہم لاہور سے بول رہے ہیں۔ تیرہ اور چودہ اگست سن سنتالیس عیسوی کی درمیانی رات۔ بارہ بجے ہیں۔ طلوعِ صبحِ آزادی"۔

یہی وہ دوسطری اعلان ہے جس پر سینٹرل پروڈکشن یونٹ ریڈیو پاکستان کے دعوے کی پوری عمارت تعمیر کی گئی۔ ایک ایسی عمارت جس کی بنیاد ہی غلط ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں اس اعلان کے بارے میں مصطفیٰ علی ہمدانی کے صاحبزادے صفدر ہمدانی کا مؤقف کیا ہے۔ مگر اس کے لیے ہمیں تھوڑا سا ماضی میں جانا پڑے گا۔

یہ اگست 2007ء کی بات ہے جب بی بی سی اردو کی ویب سائٹ پر برادرم وسعت اللہ خان کا ایک بلاگ شائع ہوا، جس کا عنوان تھا "ساٹھ برس اور حافظہ"۔ اس بلاگ میں کئی دوسرے انکشافات کے ساتھ ساتھ وسعت اللہ خان نے تحریر کیا تھا کہ:

"جہاں تک یہ سوال ہے کہ ریڈیو پاکستان سے آزادی کی نصف شب سب سے پہلے کس کی آواز نشر ہوئی تو اس بارے میں تاریخی حقائق کچھ یوں ہیں کہ پاکستان کے حصے میں چودہ اور پندرہ اگست کی درمیانی شب تین باقاعدہ ریڈیو سٹیشن آئے یعنی لاہور، پشاور اور ڈھاکہ سے چودہ

اگست کی رات گیارہ بجے تک آل انڈیا ریڈیو کی نشریات جاری رہیں۔

بارہ بجنے سے کچھ ساعت قبل لاہور ریڈیو سٹیشن سے پاکستان براڈ کاسٹنگ کی نئی شناختی دھن بجائی گئی اور پھر ظہور آزر نے انگریزی میں یہ اعلان کیا: 'نصف شب کو بارہ بجے کا گجر بجتے ہی پاکستان کی آزاد و خود مختار ریاست وجود میں آجائے گی۔'

اسکے بعد ٹھیک بارہ بجے ظہور آزر نے انگریزی میں یہ اعلان کیا: ' یہ پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس لاہور ہے۔ اب ہم ایک خصوصی پروگرام پیش کر رہے ہیں 'صبحِ آزادی'۔

اس اعلان کے فوراً بعد مصطفیٰ علی ہمدانی نے اردو میں یہی اعلان کچھ ایسے دہرایا: ' اسلام و علیکم۔ پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس۔ ہم لاہور سے بول رہے ہیں۔ رات کے بارہ بجے ہیں۔ پروگرام سنیئے طلوعِ صبحِ آزادی۔'

اور اس کے ساتھ ہی اقبال کا ترانہ ملی مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا نشر ہونا شروع ہوا۔

بالکل اسی وقت پشاور سے ٹھیک بارہ بجے پہلی اناؤنسمنٹ اردو میں آفتاب احمد بسمل نے کی جبکہ اس کے فوراً بعد پشتو میں یہی اعلان عبد اللہ جان مغموم نے دھرایا۔ اور پھر احمد ندیم قاسمی کے لکھے گئے دو ملی نغمے نشر ہوئے، جبکہ ریڈیو ڈھاکہ سے بارہ بجے کا گجر بجتے ہی کلیم اللہ نے انگریزی میں قیامِ پاکستان کا اعلان کیا اور اس کے بعد بنگلہ میں اعلان دہرایا گیا۔

لیکن چند برس بعد جب یہ سوال متنازع ہوا کہ پاکستان چودہ اگست کو وجود میں آیا یا پندرہ اگست کو تو اسکے ساتھ ہی یہ بحث بھی چھڑ گئی کہ ریڈیو پر نئی مملکت کے قیام کا اعلان تیرہ اور چودہ اگست کی درمیانی شب کو ہوا تھا، یا چودہ اور پندرہ اگست کی درمیانی شب کو۔

انیس سو پچاس میں ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر تعلقات عامہ ن م راشد نے 'تھری ایئرز آف ریڈیو پاکستان' کے نام سے جو کارکردگی نامہ شائع کیا اس کے مطابق اعلانِ پاکستان چودہ اور پندرہ اگست کی درمیانی شب ہوا۔ لیکن جب اسی ریڈیو پاکستان نے اپنے ہی رسالے آہنگ کا گولڈن جوبلی نمبر شائع کیا تو اس میں یہ لکھا گیا کہ اعلانِ پاکستان تیرہ اور چودہ اگست کی درمیانی شب کیا گیا۔

پالیسیاں تو ہر حکومت تبدیل کرتی ہے لیکن پاکستانی حکومتیں نہ صرف پالیسیاں بلکہ تاریخ اور حافظہ تبدیل کرنے میں بھی یکساں مہارت رکھتی ہیں۔ کون کہتا ہے کہ پاکستان جمود کا شکار ہے۔"

وسعت اللہ خان کے اس بلاگ کی اشاعت کے بعد مصطفیٰ علی ہمدانی کے صاحبزادے صفدر ہمدانی نے اس کا ایک طویل جواب لکھا جو "پاکستان میں ساٹھ برس میں طے نہیں ہو سکا" کے عنوان سے چھ اقساط میں پہلے القمر آن لائن کی ویب سائٹ پر اور پھر صفدر ہمدانی کی اپنی ویب سائٹ عالمی اردو اخبار پر شائع ہوا۔ صفدر ہمدانی صاحب نے اپنے اس طویل جواب کی چوتھی قسط میں یہ اعتراف کیا کہ وہ اپنے والد کی جس ریکارڈنگ کا حوالہ دے رہے ہیں وہ ریڈیو پاکستان کے ریکارڈ میں موجود نہیں۔ 1973ء میں جب ریڈیو پاکستان کی سلور جوبلی تقریبات منائی جا رہی تھیں تو ریڈیو پاکستان کے حکام نے اس ریکارڈنگ کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ریکارڈنگ دستیاب نہ ہو سکی۔

انھوں نے اپنے اس بلاگ کے ساتھ اپنے ذاتی آرکائیو میں محفوظ اپنے والد کے مذکورہ اعلان کی ریکارڈنگ شیئر کی اور لکھا کہ "اب ذرا اگر

مزید تفصیل سے بیان کروں تو یہ بھی بتانا ہو گا کہ یہ ریکارڈنگ کوئی گھریلو یا ذاتی ریکارڈنگ نہیں بلکہ سرکاری طور پر ریڈیو پاکستان کے سینٹرل پروڈکشن کے ایک منصوبے "تاریخ نشریات" کے عنوان کے تحت 1973ء میں لاہور کے سینٹرل پرڈکشن اسٹوڈیوز میں ہوئی تھی جہاں اس وقت اس شعبے کے لاہور کے سربراہ چوہدری بشیر تھے اور اس کے پروڈیوسر برادرم ناصر قریشی تھے اور 30 منٹ سے زائد دورانیے کا یہ انٹرویو اس وقت کے بچوں کے پروگرام کے نہایت مقبول بھائی جان ابوالحسن نغمی (حال مقیم واشنگٹن) نے لیا تھا جس میں آزادی کی اس اولین رات کی ساری کہانی موجود تھی۔

آزادی کے لگ بھگ 26 سال بعد 1973 میں ریڈیو کو پہلی بار یہ خیال آیا کہ اس آواز اور ان الفاظ کو محفوظ کر لیا جائے اور شکر ہے کہ یہ سب کچھ ٹیپ پر محفوظ ہو گیا ورنہ اگر اس ریکارڈنگ کی موجودگی میں اس سارے عمل کو متنازع بنانے کی یہ حالت ہے تو ٹیپ موجود نہ ہونے کی صورت میں کیا ہوتی۔

یہ ایک الگ قصہ ہے کہ "تاریخِ نشریات" کے نام سے سینٹرل پروڈکشن کی شائع شدہ سرکاری فہرست میں موجود یہ ٹیپ کم از کم تین بار بوجوہ غائب کی گئی اور اسے تین بار تلاش کیا گیا اور اب آخری خبروں تک ایک بار پھر سے یہ ٹیپ سینٹرل پروڈکشن کے کسی مرکز حتیٰ کہ اسلام آباد کے مرکزی شعبے میں موجود نہیں۔ کاش اس جانب کوئی توجہ دے"۔

محترم صفدر ہمدانی نے اپنے اس طویل بلاگ میں کئی جگہ یہ دعویٰ کیا کہ ریڈیو پاکستان سے اولین اعلان آزادی ان کے والد مصطفیٰ علی ہمدانی نے کیا تھا اور مصطفیٰ علی ہمدانی کے اعلان سے پہلے ظہور آزر کے انگریزی میں کیے جانے والے اعلان کا دعویٰ غلط ہے (جبکہ دو تین روز قبل سینٹرل پروڈکشن یونٹ ظہور آزر کا مذکورہ اعلان بھی ایک الگ ویڈیو کی شکل میں ریلیز کر چکا ہے)۔ اس کے ساتھ سینٹرل پروڈکشن یونٹ، ریڈیو پاکستان نے مصطفیٰ علی ہمدانی کی ریکارڈنگ پر مشتمل جو ویڈیو ریلیز کی ہے وہ اگست 1947ء کی نہیں بلکہ وہی ریکارڈنگ ہے جو 1973ء میں ریکارڈ کی گئی تھی۔ یہ انکشاف ہم نہیں کر رہے ہیں بلکہ خود مصطفیٰ علی ہمدانی کے صاحبزادے صفدر ہمدانی نے کیا ہے۔

ریڈیو پاکستان کے ریکارڈ کے مطابق ریڈیو پاکستان کی اولین سرکاری تاریخ Three years of Radio Pakistan کے عنوان سے 1950ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ریڈیو پاکستان کے پبلک ریلیشنز ڈائریکٹریٹ نے 1950ء میں شائع کی تھی اور اس کے مرتب مشہور شاعر ن۔م۔راشد تھے جو ان دنوں اس ڈائریکٹریٹ کے سربراہ تھے۔ اس کتاب میں واضح طور پر تحریر کیا گیا ہے کہ ریڈیو پاکستان لاہور، ریڈیو پاکستان پشاور اور ریڈیو پاکستان ڈھاکا کی نشریات کا آغاز 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب بارہ بجے ہوا۔

اسی موضوع پر ریڈیو پاکستان کے پہلے کنٹرولر نیوز حامد جلال نے پاکستان کے ڈائریکٹریٹ آف فلمز اینڈ پبلی کیشنز کے اہتمام میں شائع ہونے والے جریدے ماہ نو کے نومبر، دسمبر 1976ء کے شمارے میں ایک مضمون تحریر کیا جس کا عنوان تھا "پاکستان کا پہلا نشری اعلان"۔ اس مضمون میں وہ تحریر کرتے ہیں:

"14 اور 15 اگست (1947ء) کی درمیانی رات، آدھی رات سے تقریباً دس منٹ پہلے اس اعلان کے پچاس منٹ بعد جب لاہور نے

ظہور آذر

آخری مرتبہ آل انڈیا ریڈیو کی حیثیت سے اعلان کیا۔ ریڈیو پاکستان کا عارضی ابتدائی نغمہ جسے خواجہ خورشید انور نے مرتب کیا تھا نشر ہوا۔ اس کے نئے پن کا مقناطیسی اثر ہوا اور ہزاروں آدمی اپنے ریڈیو سیٹوں کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ خوشی اور امید کے جذبات کے ساتھ اسے سنتے رہے۔ جب آدھی رات سے ایک منٹ پہلے اس کی آواز آہستہ آہستہ کم ہونے لگی تو فضا میں ایک اعلان ہوا ”آدھی رات کے وقت پاکستان کی آزاد اور خود مختار مملکت وجود میں آئے گی“۔ انگریزی میں اس کے ریڈر مسٹر ظہور آذر تھے جو 16 سال بعد ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل بنے۔ اردو میں یہ اعلان مصطفیٰ علی ہمدانی کی جانی پہچانی آواز میں ہوا۔

اس کے بعد دیواری گھڑی کی زور سے ٹک ٹک کی آواز آئی اور جب ٹھیک آدھی رات ہوئی تو ہزاروں سامعین نے پہلے انگریزی میں اور پھر اردو میں یہ الفاظ سنے ”یہ پاکستان براڈکاسٹنگ سروس ہے“۔ جس طرح نصف شب سے پہلے کے اعلان میں ہوا تھا اسی طرح اس اعلان میں ہندوستانی اور اردو کے نمایاں فرق نے سننے والوں کے جذبات محبت کو برانگیختہ کر دیا اور بہت سے سامعین نے شکریے کے لیے فون کیے کیونکہ ان کے نزدیک ایک آزاد مسلم وطن کا یہ پہلا اظہار تھا۔

مصطفیٰ علی ہمدانی

اس کے بعد مولانا زاہر القاسمی نے قرآن پاک کی سورۃ فتح کی افتتاحی آیتوں کی تلاوت کی۔ اس تلاوت کے بعد ریڈیو پاکستان کا آرکسٹرا بجایا گیا جس کی نئی ترتیب خواجہ خورشید انور نے کی تھی۔ چونکہ سامعین طربیہ پروگرام سننے کے لیے تیار ہو چکے تھے اس لیے سنتو خان اور ان کے ہم نوائوں نے قوالی میں علامہ اقبال کی ایک نظم پیش کی۔ وہ مبارک علی اور فتح علی کے زیادہ مشہور و معروف قوالی گروپ کا نعم البدل تھے جو سرحد کے قریب ہندوستان میں پھنسے ہوئے تھے کیونکہ اسٹین گنوں اور دوسرے ہتھیاروں سے لیس، سکھوں کے لوٹ مار کرنے والے جتھے مسلمانوں پر حملہ کر رہے تھے۔

”آدھی رات کو آزادی“ کی یہ ٹرانسمیشن جناب حفیظ ہوشیارپوری کی جدوجہد پاکستان پر تقریر پر ختم ہوئی لیکن شادمانی کی اس لہر میں ان

مسلمانوں کے بارے میں بے حد اضطراب بھی شامل تھا جو پاکستان کی طرف رواں تھے یا ایسے مقامات پناہ کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ ایک پاکٹ سٹی بنا سکیں گے اور سفاک دشمنوں کا مقابلہ کر سکیں گے"۔

حامد جلال کے اس بیان کی تائید خود سنتو خان بھی کرتے ہیں انہوں نے اپنے ایک انٹرویو (مطبوعہ آہنگ، اگست 1997ء) میں بتایا:

"میں بڑی مشکل سے ریڈیو اسٹیشن پہنچا تھا جناب، ہماری پارٹی ریڈیو پر آئی... ریڈیو پر آکر اطمینان کا سانس لیا۔ ہم تقریباً چار بجے سہ پہر ریڈیو اسٹیشن پر پہنچے تھے۔ جب ہمیں کلام اقبال پڑھنے کے لیے دیا گیا تو ہمیں بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا... یا اللہ تیرا شکر ہے... ہمارا یہ پاکستان وجود میں آگیا ہے... بس جی بہت مسرت ہوئی۔ ہم نے علامہ اقبال کا یہ کلام

زمانے کے انداز بدلے گئے

نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

ریڈیو پاکستان لاہور سے لوگوں کو سنایا۔ قوالی کی طرز میں نے خود بنائی تھی۔ میرا بیٹا منظور اس وقت چھوٹا سا تھا، باقی پارٹی کے تمام افراد اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ میں کیا بتاؤں لوگوں کا کیا جذبہ تھا۔ میری قوالی کے بعد لوگوں نے مجھے بہت مبارک باد دی تھی۔ ایک دوست نے تو یہ کہا تھا کہ سنتو خان پاکستان بننے کا پہلا دن تیرے ذمے لگ گیا ہے"۔

آہنگ کے اس مضمون "صبح آزادی وطن" میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ ریڈیو پاکستان کے پہلے پروگرام میں اس وقت کے مشہور لوک فن کار عبد العزیز بھی شامل تھے جنہوں نے صحرائی گورداسپوری کا لکھا ہوا ایک پنجابی ملی نغمہ گایا تھا۔

عبد العزیز بتاتے ہیں:

"صحرائی گورداسپوری نے سب سے پہلے مجھے دیہاتی بھائیوں کے پروگرام کے لیے نغمہ لکھ کر دیا تھا۔ مجھ ناچیز نے وہ نغمہ گایا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر حمید شیخ تھے۔ 14 اگست کو میں نے پہلا پنجابی نغمہ گایا تھا۔ میں سیکریٹریٹ سے پیدل روانہ ہوا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن پر مجھے مصطفیٰ علی ہمدانی ملے۔ انہوں نے مجھ سے کہا عبد العزیز کیسے آئے ہو؟ میں نے جواب دیا، مجھے میرا جذبہ کھینچ لایا ہے۔ انہوں نے کہا "تمہارا پروگرام رات ساڑھے بارہ بجے ہو گا، اپنے ساتھیوں کو تیار کر لو۔ میں نے کہا سیکریٹریٹ سے اپنے ساتھی بلوا لیے ہیں۔ اناؤنسمنٹ ہونے والی تھی، جو میرا جذبہ تھا، اس کا بیان کرنا لفظوں میں مشکل ہے۔

میں نے جو نغمہ گایا تھا یہ تھا:

بسم اللہ بسم اللہ کہہ کے رب دا نام دھیاواں

فیر درود محمدؐ اُتے خوشیاں نال پہنچاواں

صحرائی گورداسپوری اس ملی نغمے کے خالق ہیں"۔

صحرائی گورداسپوری کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کا پنجابی ملی نغمہ صبح آزادی وطن کے پروگرام میں شامل تھا۔ انہوں نے اپنے تاثرات

یوں قلم بند کروائے ہیں:

"میں پاکستان بننے سے پہلے ملٹری میں ملازم تھا۔ مسلم لیگ کا اس وقت بہت زور تھا۔ قائد اعظم کی آواز پر میں آگے بڑھا اور ملٹری سے استعفیٰ دے کر مسلم لیگ میں شامل ہو گیا۔ یہ 1944ء کی بات ہے اس کے بعد جلسوں اور جلوسوں میں شامل ہوتا رہا۔ کچھ مدت میں نے جیل بھی کاٹی لیکن میں جیل میں بھی ملی نغمے تحریر کرتا رہا۔ پھر اللہ نے 14 اگست کو پاکستان دیا۔ میں اس وقت بھرپور جوان تھا۔ میرے جذبات اس وقت یہ تھے کہ اگر میں پاکستان کے لیے جان بھی قربان کر دیتا تو بڑی بات نہ تھی۔ میں نے اپنے اشعار کے حوالے سے پاکستان کی خدمت کی ہے"۔

آفتاب احمد بسمل

صبح آزادی کے پروگرام میں مشہور گلوکارہ منور سلطانہ بھی شامل تھیں۔ انہوں نے بتایا:

"شیخ حمید صاحب یہاں ہوتے تھے۔ وہ میرے پاس آئے، گھر پر۔۔۔ کہنے لگے "منور سلطانہ آپ کو میرے ساتھ ریڈیو اسٹیشن چلنا ہے۔ میں گھبر اگئی کہ ایسے حالات میں کیسے جاسکتی ہوں۔ کرفیو بھی لگا ہوا تھا اور بلیک آوٹ بھی۔ رات کا وقت تھا۔ شہر میں فساد کی افواہیں تھیں۔ وہ کہنے لگے کہ تم گھبراو نہیں، میں گاڑی میں آیا ہوں، مسلح فوجی میرے ساتھ ہیں میں آپ کو حفاظت سے ریڈیو اسٹیشن لے جاوں گا۔ چھ سات فوجی ان کے ساتھ تھے۔ تو آپ میرے ساتھ چلیں۔ اس پر میرے والد صاحب کہنے لگے، دیکھو بیٹی، اپنے شوق سے تو بہت کچھ کیا تم نے... اب میری بات مانو... چلی جاؤ۔ ایسے مواقع تو بار بار نہیں آتے۔ یہ تو بہت اہم دن ہے۔ بہت بڑا دن ہے تمہارے لیے... ہمیں ملک ملنے والا ہے۔ آزادی ملنے والی ہے... تم ضرور جاؤ۔ بس میں حمید شیخ کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن آئی اور یہ گانا یہاں آکر گایا
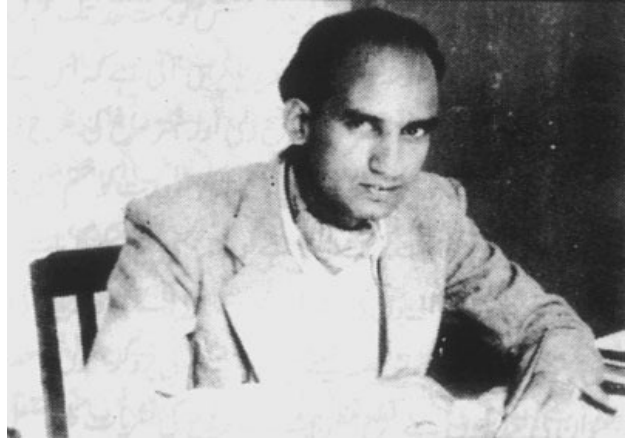
توحید کے ترانے کی تانیں اڑائے جا

(یہ نغمہ مولانا ظفر علی خان کا تحریر کردہ تھا) سبھی بے تابی سے اس اعلان کا انتظار کر رہے تھے۔ تو ہمیں بھی بڑی خوشی تھی۔ ایسے جذبات تھے جن کا میں لفظوں میں اظہار نہیں کر سکتی"۔

عبد اللہ جان مغموم

یہ تو تھی ریڈیو پاکستان لاہور کی نشریات کی صورت حال اور آیئے دیکھتے ہیں عین اسی وقت ریڈیو پاکستان پشاور میں کیا ہو رہا تھا۔
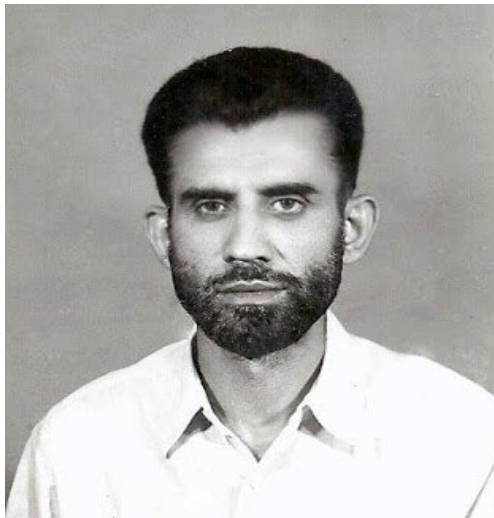
نہال احمد نے اپنی کتاب A History of Radio Pakistan میں تحریر کیا ہے کہ:

" ریڈیو پاکستان (پشاور) کا آل انڈیا ریڈیو کا اختتامی اعلان رات گیارہ بجے یونس سیٹھی نے کیا۔ رات ٹھیک بارہ بجے پاکستان براڈکاسٹنگ سروس کی نشریات کا آغاز ہوا۔ پشاور سے پہلی اناؤنسمنٹ اردو میں آفتاب احمد بسمل نے کی جبکہ اس کے فوراً بعد پشتو میں یہی اعلان عبداللہ جان مغموم نے دہرایا۔ ان اعلانات کے بعد احمد ندیم قاسمی کے لکھے ہوئے دو ملی نغمے نشر ہوئے جن کی موسیقی سجاد سرور نیازی نے ترتیب دی تھی۔ ان میں سے پہلے نغمے کا مطلع تھا، " پاکستان بنانے والے، پاکستان مبارک ہو۔"

صفدر ہمدانی نہ ہی تو ظہور آزر کے انگریزی اعلان کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ پشاور اور ڈھاکہ سے قیام پاکستان کا اعلان کرنے والے اناونسرز کو اپنے والد جیسی اولیت دینے کو تیار ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے تینوں اسٹیشنز سے قیام پاکستان کا اعلان بہ یک وقت ہوا تھا مگر بار بار یہ بات کیوں بتائی جارہی ہے کہ ریڈیو پاکستان سے پاکستان کے قیام کا اعلان صرف اور صرف مصطفیٰ علی ہمدانی نے کیا۔

PAKISTAN TIMES

Founded by Qaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah

LAHORE—FRIDAY, AUGUST 15, 1947, 27 RAMAZAN-UL-MUBARAK, 1366 A.H.

Pakistan Broadcasting Service to take over 3 stations

The three radio stations in Pakistan—Lahore, Peshawar and Dacca—will be taken over by the Pakistan Broadcasting Service at midnight tonight.

The Lahore station has arranged to broadcast a special programme on the occasion to celebrate the birth of Pakistan. The programme will be on the air from midnight to 1 a.m.

At 8-30 the same morning (Friday) a recorded message from Qaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah to the people of Pakistan will be broadcast. Dacca and Peshawar will also broadcast this message.—API.

Pakistan Times, August 15, 1947

یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ 15 اگست 1947ء کو پاکستان ٹائمز لاہور میں ایک خبر شائع ہوئی جس کے مطابق پاکستان براڈکاسٹنگ سروس کے تین اسٹیشنوں کا قیام 14 اور 15 اگست کی درمیانی رات موجود میں آیا۔ یہ اسٹیشنز لاہور، پشاور اور ڈھاکہ میں قائم کیے گئے تھے۔ اس خبر میں یہ بھی درج تھا کہ 15 اگست 1947ء (جمعہ) کی صبح قائداعظم قوم سے خطاب کریں گے جو پاکستان براڈکاسٹنگ سروس کے تینوں اسٹیشنز نشر کریں گے۔ خوش قسمتی سے اس خطاب کی ریکارڈنگ یوٹیوب پر موجود ہے۔ جس میں قائداعظم نے فرمایا ہے کہ:

August 15 is the birthday of the independent and sovereign state of

Pakistan. Today is Jummat-ul-Wida, last Friday of holy month of Ramazan, a day of rejoicing for all of us

قائدِ اعظم نے فروری 1948ء میں امریکی عوام سے ریڈیو خطاب میں کہا

This Dominion which represents the fulfilment, in a certain measure, of the cherished goal of 1000 million Muslims of this sub-continent came into existence on August 15, 1947.

یہ اقتباسات بطور گورنر جنرل قائد اعظم کی تقریروں اور بیانات کی سرکاری طور پر شائع کی گئی کتاب میں سے ہیں۔ انہوں نے اس تاریخ کا چند اور جگہ بھی ذکر کیا ہے۔

نہال احمد کی کتاب "ہسٹری آف ریڈیو پاکستان" کو صفدر ہمدانی اس لیے مستند تسلیم نہیں کرتے کہ یہ کتاب ریڈیو پاکستان کے اہتمام میں شائع نہیں ہوئی، مگر کیا وہ ریڈیو پاکستان کے اہتمام میں شائع ہونے والی ن۔م۔راشد کی مرتب کردہ کتاب Three years of Radio Pakistan، حامد جلال کے مضمون "پاکستان کا پہلا نشری اعلان" اور ریڈیو پاکستان کے سرکاری جریدے آہنگ کے اگست 1997ء کے مندرجات کو بھی تسلیم نہیں کریں گے۔ پاکستان ٹائمز کی مذکورہ بالا خبر بھی ان کے نزدیک غلط ہوگی اور قائد اعظم کی تقریر کی آڈیو کلپ کو بھی وہ مشکوک قرار دیں گے مگر ایک اناؤنسمنٹ جو قیام پاکستان کے 26 سال بعد دوبارہ ریکارڈ کی گئی اس میں شاید یادداشت کی بنا پر ہونے والی ایک انسانی غلطی کو درست ثابت کرنے کے لیے وہ تمام معیارات کو پس پشت ڈال دیں گے۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے۔

سینٹرل پروڈکشن یونٹ ریڈیو پاکستان سے گزارش ہے کہ وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ریڈیو پاکستان کا قیام 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب کی بجائے 13 اور 14 اگست 1947ء کی درمیانی شب کو عمل میں آیا تھا۔ مصطفیٰ علی ہمدانی کی مذکورہ بالا متنازع ریکارڈنگ کے علاوہ اس رات کی کوئی اور ریکارڈنگ بھی شیئر فرمائیں۔ اگر ریکارڈنگ موجود نہیں تو ریڈیو پاکستان کے لاہور یا پشاور اسٹیشنز کی لاگ بک تو موجود ہوگی وہی شیئر فرما دیجئے ورنہ قوم سے معذرت کیجئے کہ آپ 1947ء کے 26 سال بعد 1973 میں کی گئی ایک ریکارڈنگ کی بنیاد پر پاکستان کے یوم آزادی کی تاریخ بدلنے کے جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

بشکریہ "ہم سب" ۱۵ اگست ۲۰۲۰ء

https://www.humsub.com.pk/338388/aqeel-abbas-jafri-9/

ظفر اللہ خان

میرے ابا جان، سائنسی تحقیق اور جانو جرمن کچھوا

جس کرائے کے گھر میں ہم ستر کی دہائی میں مقیم تھے وہ دو کمروں پر مشتمل ایک چڑیا گھر تھا۔ ہم چار بہن بھائیوں کی موجودگی میں وہاں شیر، ہاتھی چیتے وغیرہ کی گنجائش تو نہیں نکلتی تھی مگر امی، جو مقامی کالج میں لڑکیوں کو فارسی پڑھاتی تھیں، اپنے تمام تر قلبی تعلق اور محبت کے باوجود شاید ہم بچوں کو یکے از نوعِ حیوانات ہی سمجھتی تھیں۔ ایک واقعہ جو امی خود سنا کر بہت لطف اُٹھاتی تھیں، کچھ یوں ہے کہ ایک بار وہ شاید مجھے یا میرے چھوٹے بھائی کو اسکول چھوڑ کر آئیں اور جونہی گھر کے صحن میں قدم رکھا، کیا دیکھتی ہیں کہ ایک کتابوں بھرا بستہ اُڑتا ہوا آیا ہے اور ان کے سامنے زمین بوس ہو گیا ہے۔ وہ غیض و غضب میں بھری ہوئی گھر سے باہر نکلیں تو سامنے انہیں اپنا وہ صاحبزادہ دکھائی دیا جس کو وہ اپنی دانست میں اسکول چھوڑ کر آئی تھیں۔ یہ دیکھ کر وہ فورا برقع سنبھالے اس کے پیچھے لپکیں تا کہ جی بھر کے اس کی تادیب کر سکیں، اور وہ بچہ جان بچانے کی غرض سے سبزی منڈی کی جانب ایک سڑک پر بھاگنے لگا۔ کچھ ہی دور پہنچے تو دیکھا کہ ایک جگہ بقول امی جان کچھ آوارہ لڑکے کھڑے تھے
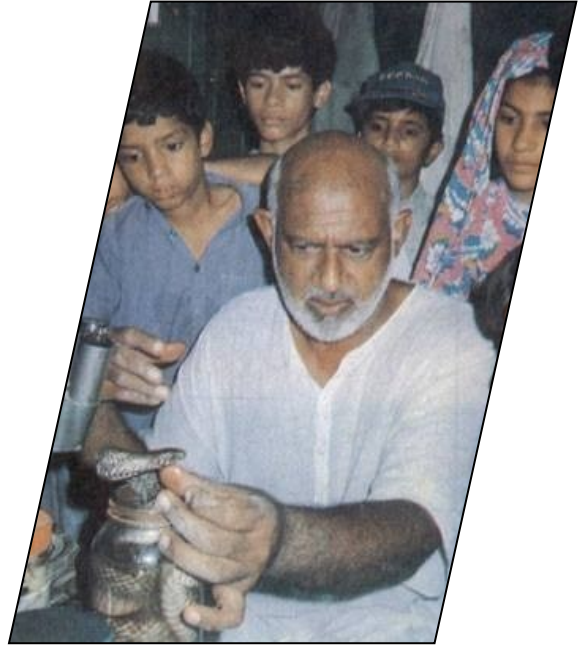
پروفیسر ڈاکٹر محمد شریف خان

جن میں سے ایک نے موقع غنیمت جان کر اس میاں صاحبزادے کے ایک دو تھپڑ جڑ دیئے۔ امی اپنا غصہ بھول بھال، اس روتے ہوئے لال کی دل جوئی کرنے لگیں۔ امی جان کی پھٹکار پر وہ مارنے والا لڑکا جب بھاگا تو فی الفور اس کے گھر مار کا حساب لینے چلی گئیں۔

خیر ہمارے اسی چھوٹے سے گھر میں ہمارے علاوہ ابا جان (ڈاکٹر محمد شریف خان) کے سانپ، چھپکلیاں اور مینڈک بھی مقیم تھے، خواہ زندہ ہوں یا مردہ۔ ابا جان کے گورنمنٹ کالج لاہور کے استاد ڈاکٹر احسن الاسلام نے ایم ایس سی کی تعلیم کے دوران ان کو تحقیق و تدقیق کی جس راہ پر ڈال دیا تھا اس میں وہ دو کمروں کی تنگی کو ہرگز حارج نہیں سمجھتے تھے۔ ایک روز امی جب کالج سے گھر واپس آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ گھر کے اس کمرے میں، جو بیک وقت بیڈ روم اور ڈائننگ روم تھا، چند بے کواڑ الماریوں میں ابا جان کے یہ سانپوں، چھپکلیوں اور مینڈکوں بھرے مرتبان جو پہلے کہیں چارپائیوں تلے چھپے رہتے تھے، اپنے اپنے لیبل سمیت بہارِ جانفزا دکھلا رہے ہیں۔ اس دن ابا کی آمد پر کچھ دیر تو گھر میں قیامت کا سماں رہا، جس دوران امی نے ابا جان پر یہ بات واضح کر دی کہ ہمارا معاشرتی ارتقاء ابھی اس مقام تک نہیں پہنچا جہاں ان الماریوں میں تام چینی کے برتنوں کے بجائے یہ سانپ اور مینڈک بھرے مرتبان سجائے جا سکیں۔ اس مناقشے کے بعد ابا جان نے یہی مناسب سمجھا کہ یہ متاعِ تحقیق واپس کالج کی تجربہ گاہ میں پہنچا دی جائے۔ اب دقت یہ آن پڑی کہ کالج کے بعض جونیر اساتذہ ابا پر یہ الزام لگانے لگے کہ وہ اس تجربہ گاہ کا استعمال اپنی ذاتی تحقیق کے لئے کرتے ہیں اور وہاں کی الماریاں اپنے مرتبانوں سے بھرتے ہیں۔ اس لئے ابا جان کے پاس یہ سب مال گھر لانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ خیر۔۔۔ جب قضائے الٰہی سے ہماری انتہائی مشفق اور محب، نانی جان کی وفات ہوئی اور نانا جان صحت کی مستقل خرابی کے باعث بڑے ماموں کے ہاں لاہور چلے گئے، نانا جان کا گھر خالی ہو گیا، بڑے ماموں نے کمال مہربانی سے ہمارے والدین کو مشورہ دیا کہ کرائے کا گھر چھوڑ کر اس گھر میں شفٹ ہو جائیں۔ نانا جان کا گھر بہت وسیع تھا اور وہاں امی نے ایک کمرہ جو بقیہ گھر سے الگ تھلگ تھا ابا کو سونپ دیا۔ وہ کمرہ ابا کی تجربہ گاہ ٹھہرا مگر ان مرتبانوں کی تعداد اب روز بروز بڑھنے لگی کیونکہ انہوں نے ارد گرد کے دیہات میں یہ اعلان کروا رکھا تھا کہ جو بھی ان کو مردہ سانپ یا مینڈک وغیرہ لا کر دے گا، اس کو دس روپے بطور معاوضہ ملیں گے۔ آخر اسی گھر کے ایک کونے میں بنا ہوا ایک کچا کوٹھا بھی ابا جان کو تفویض ہو گیا اور ان جانوروں کے رکھنے کا مسئلہ حل ہوا۔ اس زمانے میں ابا جان نے اپنے فرماں بردار شاگردوں کو جو پاکستان کے مختلف حصوں میں مقیم تھے کہلوا بھیجا کہ مجھے اپنے اپنے علاقوں کے سانپ اور مینڈک بھجوایا کرو۔ کچھ صاحبانِ ذوق تو ابا جان سے وہ محلول (جس کی بدبو میری بچپن کی یادوں میں رچ بس گئی ہے اور) جس میں مردہ جانوروں کو preserve کیا جاتا تھا، ہمراہ لے جاتے اور سال میں ایک آدھ بار اپنی اپنی توفیق کے مطابق سانپ یا مینڈک بطور ہدیہ اپنے استاد کی نذر کرتے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے گھر میں پہلا ٹیپ ریکارڈر اس لیے خریدا گیا تا کہ ابا جان برسات کی راتوں میں ارد گرد کے کماد کے کھیتوں میں گھوم پھر کر مینڈکوں کے ٹرّانے کی آوازیں ریکارڈ کر سکیں۔ ان آوازوں کا ایک وسیع خزانہ کئی سال ہمارے گھر میں رہا۔ بعد ازاں جب انہیں کیسٹوں پر ہم اپنے پسند کے فلمی گانے ریکارڈ کرتے تو دو گانوں کے درمیان وقفے میں وہ مانوس ٹر ٹر عجیب سماں باندھ دیتی۔ ابا جان

نے ہی بتایا کہ صرف نر مینڈک ٹراتے ہیں تاکہ مادہ مینڈک انہیں ڈھونڈ سکے اور عملِ تولید کا آغاز ہو۔ اور ہر نوع کا مینڈک اپنے سُر میں ٹراتا ہے۔ اگر آپ غور فرمائیں تو فلمی گانوں کا بھی بظاہر یہی مقصد ہوتا ہے۔ اس پر ہمیں ایک بار یہ خیال آیا کہ کیا خبر انسانوں میں نطق کے ارتقاء کی اصل وجہ یہی ہو۔ اور انسان تک آتے آتے صفتِ تکلم کی کلید مرد سے لے کر عورت کے حوالے کر دی گئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

برسات کے دنوں میں دیہاتی بڑے سانپ (جن میں سے بعض 10 فٹ لمبے ہوتے) ہمارے گھر لاتے۔ ابا زیادہ تر سانپوں کے بارے میں یہی کہتے کہ چوہے کھانے والے ہیں اور ہر گز زہریلے نہیں۔ ایک بار ہم سب نے ضد کی کہ ایک زندہ سانپ جو ابا کے پاس تھا رسی سے باندھ کر دکھائیں۔ ابا نے ہماری خواہش پوری کر دی۔ مگر سانپ ایک آدھ بار بل کھا کر اس رسی سے نکل گیا اور اس نے ان کے بازو پر کاٹ کھایا۔ ابا کو دیکھا تو وہ مسکرا رہے تھے۔ ہم نے پریشانی میں پوچھا اب کیا کریں، انہوں نے مجھ سے برنال منگوائی اور زخم پر لگائی اور بڑے رسان سے بتایا کہ یہ سانپ زہریلا نہیں تھا۔ مگر اس کے بعد یہ ہوا کہ ہمارے گھر میں ان تمام موذی جانوروں کا زندہ داخلہ بحکم امی جان بند ہو گیا۔ اگرچہ اس حکم کی خلاف ورزی بھی ہوتی رہتی۔ ایک بار ہمیں بھنک پڑی کہ ابا کے پاس ایک بڑا زہریلا سانپ آیا ہے۔ ہم نے اصرار کیا کہ ہمیں اس کا زہر نکال کر دکھائیں۔ پہلے ابا نے اس سانپ کی کُلیاں ہمیں دکھائیں جو اصل میں تھوک پیدا کرنے والے غدود ہوتے ہیں۔ آخر لوہے کا ایک گلاس منگوایا گیا اور ابا جان نے اس سانپ کی گردن دبا کر اسکا منہ کھولا اور اسکے اوپر کے جبڑے کو گلاس کے کنارے کے ساتھ لگا کر جب دبایا تو ایک دو قطرے اس گلاس میں آگرے۔ اس کے بعد وہ گلاس مٹی میں گہرا دبا دیا گیا۔ ابا جان سے ہی پہلی بار معلوم ہوا کہ اکثر سانپوں کا زہر براہِ راست اعصاب کو شل کر دیتا ہے۔ یہ میرے سامنے کی بات ہے کہ ایک دفعہ دو بچے ایک مومی لفافے میں ایک چھوٹا سا سیاہ رنگ کا سانپ لائے۔ ابا جان نے بعد میں بتایا کہ وہ سنگچور سانپ تھا، جو بے حد زہریلا ہوتا ہے اور مردہ نہیں تھا مگر hibernate کر رہا تھا، اس لئے ان بچوں نے مردہ سمجھ کر اُٹھا لیا۔

اس بات کے کئی سال بعد ہم نے نوٹ کیا کہ ابا جان کے کمرے میں ایک چوکور شے پر کالا کپڑا پڑا ہوا ہے۔ ایک دن تجسس کے مارے ہم نے وہ کپڑا اُٹھایا تو حیران رہ گئے۔ وہ ایک شیشے کا بنا ہوا چوکور ڈبا تھا جس میں ایک تہائی ریت بھری تھی اور ریت پر آٹھ دس بڑے بڑے بچھو اپنی اولاد سمیت چہل قدمی کر رہے تھے۔ ہم سمجھے کہ آخر ابا جان موضوع کی یکسانیت سے تنگ آکر شاید اب بچھوؤں پر کام شروع کر رہے ہیں۔ پوچھا تو پتا چلا کہ انکا ایک دوست محقق ہے جو سوئٹزرلینڈ کا باشندہ ہے اور اس کو اپنی تحقیق کے لئے مقامی بچھو درکار ہیں۔ یہ خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ بچھو ابا جان نے کیسے اکٹھے کیے تھے۔ پھر ان موذی جانوروں کا بین الاقوامی تبادلہ شروع ہو گیا۔ ابا جان کے پاس ایسی ڈاک آنے لگی جس میں محفوظ کیے ہوئے مردہ مینڈک یا سانپ نیویارک، ٹورانٹو یا جرمنی کی تجربہ گاہوں سے آتے اور ابا جان ان کا مطالعہ کر کے بحفاظت واپس بھجوا دیتے۔

ابا جان سال میں ایک بار collection کے لئے پاکستان کے کسی مخصوص علاقے کا چکر لگاتے۔ اکثر ان کے بی ایس سی کے شاگرد ان کے

ہمراہ ہوتے۔ ایک بار وہ ضلع پنڈ دادن خان گئے تو ایک پولیس افسر نے ایک لڑکے کے ہاتھ میں ائیر گن دیکھ کر اس سے اس کا لائسنس مانگ لیا۔ اس نے بہتیرا کہا کہ یہ ائیر گن ہے اس کا لائسنس کہاں ہوتا ہے۔ انہوں نے پوچھا کیا شکار کرنے آئے ہو، جواب ملا، چھپکلیاں۔ پولیس کو یقین نہ آیا کہ اس علاقے میں کوئی اس مقصد کے لئے بھی آ سکتا ہے آخر بات تلخ کلامی تک جا پہنچی اور اس کو بمع دوسرے طلبأ کے پولیس نے حوالات میں بند کر دیا۔ یہ سارا معاملہ اباجان کی غیر حاضری میں ہوا جو کہیں بازار وغیرہ گئے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے تو دیکھا کہ سب شاگرد غائب ہیں۔ آخر پتہ چلا کہ وہ تو سب حوالات میں ہیں تب پولیس سٹیشن پہنچے اور تھانیدار کی منت سماجت کی پھر اس لڑکے سے معافی منگوائی تو معاملہ رفع دفع ہوا۔

بہت سال بعد کی بات ہے میں بغرضِ تعلیم جرمنی جانے کے لئے اسلام آباد سے گھر واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کھانے کی میز پر مذکورہ بالا مرتبان پڑے ہیں جن میں چھپکلیاں، مینڈک اور سانپ درجہ بدرجہ بند ہیں بلکہ اپنے اپنے محلول میں بے حس و حرکت تیر رہے ہیں۔ امی ان دنوں میری بہن کے پاس جرمنی گئی ہوئی تھیں۔ امی سے فون پر بات ہوئی اور اباجان کی خیریت کا پوچھا تو میں نے جواب میں یہ شعر پڑھ دیا

جب میکدہ چُھٹا تو پھر کیا جگہ کی قید۔۔۔۔الخ۔

امی سمجھ گئیں اباجان نہ صرف خیریت سے ہیں بلکہ ان کا تحقیقی مواد اب کھانے کی میز کی زینت بن چُکا ہے۔

☆☆☆

شیخ حامد احمد

پروفیسر شیخ محبوب عالم خالد

پروفیسر شیخ محبوب عالم خالد

حضرت شیخ محبوب عالم صاحب خالد ۱۹۰۹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم حضرت خان صاحب فرزند علی خان ناظر بیت المال و ناظر امور خارجہ و داخلہ قادیان تھے۔ مکرم خالد صاحب کا خاصہ یہ تھا کہ آپ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ حسن سلوک کے مرقد، بشاشت قلب، غریب نواز، خاکسارانہ طبیعت کے مالک، دعا گو بزرگ، حلیم طبع اور سب سے بڑھ کر آپ میں یہ خصوصیت تھی کہ آپ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ خلیفہ کی دل و جان سے اطاعت کرتے تھے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث سے محبت اور بے تکلفی کا تعلق تھا اور حضور اپنے خادم سے بہت پیار کا سلوک فرماتے تھے۔ جس قدر حضور والد صاحب کو مذاق کرتے اسی قدر والد صاحب محظوظ ہوتے۔ ایک دفعہ حضور کراچی تشریف لائے تو خاکسار کو بھی ملاقات کا موقع مل گیا۔
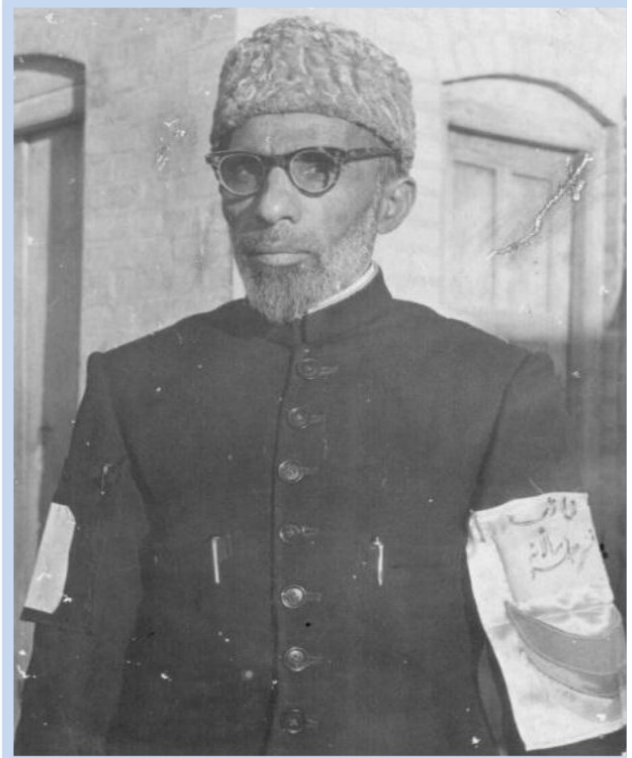
جب حضور سے مصافحہ کا شرف حاصل ہوا تو حضور سے دعا کے لیے عرض کیا اور کہا کہ میں خالد صاحب کا بیٹا ہوں۔ حضور نے ازراہ مذاق کہا کہ تم شریف خالد کے بیٹے ہو یا بدمعاش خالد کے؟ جب حضور نے ایسے کہا تو خاکسار گھبرا گیا اور خاموش ہو گیا تو حضور کے ساتھ کھڑے چوہدری محمد علی صاحب نے مجھے دیکھ کر حضور سے کہا کہ یہ بدمعاش خالد کا لڑکا ہے جو کہ آپ کے دوست ہیں جس پر حضور نے ایک زور دار قہقہہ لگایا اور کافی دیر تک میرا ہاتھ پکڑے رکھا۔

والد صاحب میں خدمتِ دین کا بہت زیادہ جذبہ تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سردیوں کے دنوں میں بھی جب حضور پر نور کا بلاوا رات کے بارہ یا ایک بجے بھی آ جاتا تو فوراً بستر سے اُٹھ کر تیار ہو کر حضور کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ حال یہ تھا کہ گھر پر فون نہیں لگوایا تھا بلکہ ہمسایہ کا فون نمبر دیا ہوا تھا اور جیسے ہی حضور کا بلاوا آتا جوانوں کی طرح تیاری کے بعد حاضرِ خدمت ہو جاتے۔ اپنے آقا کے پاس جانے کے بارے میں والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ میں دروازہ پر دستک دیتا تو حضور بعض اوقات خود دروازہ کھولتے اور شعر پڑھتے۔۔۔ خالد خستہ کے بغیر کون سے کام بند تھے۔۔۔ اور فوراً دروازہ کھول دیتے۔

جماعتی کام کا انداز یہ تھا کہ اپنے آپ کو کبھی نمایاں نہ کرتے تھے اور نہایت خاکساری میں خدمتِ دین سرانجام دیتے تھے۔ ایک دفعہ خاکسار کو محترم میاں عباس صاحب کے ہاں ڈیوس روڈ لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو معلوم کروایا گیا کہ باہر کون ہے۔ بتایا گیا تو فوراً اندر بلوا لیا گیا اور اپنے ساتھ کھانے میں شریک کیا اور یوں باتوں باتوں میں محترم والد صاحب کا ذکر بھی کرنے لگے۔ بتایا کہ آپ کے والد صاحب نہایت دعا گو اور مشفق خادمِ سلسلہ ہیں اور ان کی خدماتِ دینیہ دیکھ کر رشک آتا ہے۔ آپ کے والد صاحب دعا اور نماز کے لیے مسجد جاتے تو دیوار کے ساتھ ساتھ جاتے تھے کہ کوئی انہیں دیکھ نہ لے۔ مطلب اُن کا یہ تھا کہ کوئی اُن کو دیکھ نہ لے اپنے اللہ سے باتیں کرتے۔ اسی طرح زندگی میں سادگی اس قدر تھی اور جماعتی دوروں میں دورانِ سفر مختلف اضلاع میں ایسے ہی سادگی پسند دوستوں کے ہاں قیام کرنا پسند کرتے۔ خوراک بالکل سادہ تھی۔ بعض اوقات مختلف اضلاعی عاملہ اجلاس میں پُر تکلف کھانے پیش کیے جاتے تو ان کا حال یہ تھا کہ دوسرے دوستوں کو کہتے آپ لوگ کھانا تناول فرماتے جائیں میں آپ کا ساتھ دے رہا ہوں۔ حسن سلوک کا حال یہ تھا کہ کسے مددگار کارکن کو بھی ہمیشہ عزت و احترام سے بلاتے اور ہمیشہ خاص طور پر غریب و غربا کی بہت دلجوئی فرماتے۔ پر تکلف تقریبات یا شادیوں وغیرہ میں جانا پسند نہ تھا۔

ایک دفعہ حضرت مرزا وسیم احمد صاحب مرحوم امریکہ کے دورہ پر تشریف لائے تو ایک تقریب میں خاکسار کو جانے کا اتفاق ہوا۔ جب ان سے ملاقات ہوئی تو آپ نے ہاتھ ملایا اور دوسری متوجہ ہو گئے۔ اتفاق سے پاس ہی کھڑے کسی دوست نے کہا میاں صاحب یہ محترم شیخ محبوب عالم صاحب خالد کے بیٹے ہیں۔ اس پر میاں صاحب فوراً خاکسار کی طرف متوجہ ہوئے اور گلے لگایا اور کافی دیر تک گلے لگائے رکھا۔ اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے کہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے خاندان کی خدمات قادیان میں آپ کے والد اور آپ کے دادا خانصاحب فرزند علی کی خدمات کیا تھیں؟ اگر آپ کو علم ہے تو اپنے بچوں کو بھی بتائیں۔ اور جب کھانا شروع ہو تو خاکسار کو ازراہ شفقت کہنے لگے کہ آپ کہاں ہیں۔ آپ میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں۔

حقیقت ہے کہ یہ تو ایک طویل داستان ہے ایک خادم کی۔ مگر ان کی ۶۸ سالہ زندگی کی خدمتِ دین کو بھلایا ہی نہیں جا سکتا۔ معلوم ہے کہ اس اثناء میں مختلف مدارج پر کام کی توفیق ملنا محض ایک حادثہ نہیں بلکہ خلافت احمدیہ کے پیار کا نتیجہ ہے۔ ایک وقت تھا کہ آپ چھُپ چھُپ کر دیواروں کے ساتھ ساتھ مسجد میں جایا کرتے تھے مگر جیسے ہی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی نظر شفقت اس خادم پر پڑی تو تعارف کے بعد حضورؓ نے آپ کو مجلس خدام الاحمدیہ کی بنیاد رکھنے کے بعد اس مجلس کا پہلا جنرل سیکرٹری مقرر فرمایا۔ یہ بات حضرت والد صاحب نے MTA کے ایک طویل دورانیے کے انٹرویو میں بیان کی اور یوں مذکور ہوئے کہ آپ کا دوستی کا گہرا تعلق مرزا ناصر احمد صاحب سے بچپن سے تھا اور آپ اور میاں صاحب دونوں روزانہ مسجد اقصیٰ قادیان کی دیوار پر بیٹھتے تھے اور جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نماز کے لیے آتے اور نماز کے بعد مسجد سے جاتے تو میں اور میاں صاحب (حضرت خلیفۃ المسیح الثالث) حضور سے مصافحہ کرنے کا شرف حاصل کرتے۔ مگر میں کبھی اپنا تعارف نہیں کرواتا تھا۔ جب والد صاحب نے میٹرک کا امتحان دیا تو ان کے والد صاحب مولوی حضرت فرزند علی خاں نے ان سے کہا کہ تم حضور سے روزانہ ملتے ہو ان کو اپنے لیے امتحان میں کامیابی کے لیے دعا کا خط لکھو۔ چنانچہ والد صاحب نے حضور کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا اور جب حضور سے ملاقات ہوئی تو حضور نے فرمایا کہ برخوردار دعا تو میں تمہارے لیے کروں گا مگر مجھے علم نہیں کہ تم کون ہو۔ تم روزانہ مجھے ملتے ہو مگر کبھی تم نے بتایا نہیں کہ تم کون ہو اور تمہارے والد کون ہیں۔ اس پر آپ نے بتایا کہ میں خانصاحب فرزند علی خان صاحب کا لڑکا ہوں اور امتحان میں کامیابی کے لیے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ محترم والد صاحب بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے کہ یہی وہ وقت تھا جب حضور کی نظرِ محبت خاکسار پر پڑی اور اس کے بعد محض اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ اس نے جماعت کے تمام خلفاء کے ساتھ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

ہمیں علم ہے کہ آج یہ محبت و شفقت اور عشق الٰہی سے لبریز اسلام اور احمدیت کا۔۔۔۔۔۔ سپاہی اپنے مولا حقیقی کے حضور حاضر ہو چکا ہے۔ مگر آپ کی ۶۸ سالہ خدمات ہمارے لیے اور آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں اور ہمارے خاندان کے لیے نہ ختم ہونے والا سرمایہ ہے جو ہمارے خاندان کو محض حضرت مسیح موعودؑ کی جماعت سے عطا ہوا جس پر ہمیں ہمیشہ فخر رہے گا۔ اور اس کی وجہ سے ایسا پیار اور محبت تمام خلفاء سے ملا کہ جب ہمارے بھائی برادرم منور شمیم خالد صاحب کے نکاح کا اعلان حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کیا تو خطبہ نکاح میں فرمایا کہ آج جس نکاح کا اعلان کرنے والا ہوں وہ میرے اپنے ہی بیٹے کا ہے۔ جو کہ الفضل میں نمایاں طور پر شائع ہوا۔ ہمارے پاس حضرت والد صاحب کی سیرت کے بیان میں بہت کچھ ہے۔ مگر چونکہ اُن کی وفات کے بعد کے دس بارہ مضامین روزنامہ الفضل اور بعض اور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اس لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ اسی مختصر تحریر پر اکتفا کروں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرتا چلا جائے اور اُن کی بیش بہا خدمات کا اجر اُن کے خاندان کو عطا کرتا چلا جائے۔ اور اس مثالی خدمت کا صلہ ہم اپنی اولادوں میں نمایاں دیکھ بھی رہے ہیں۔

آپ جب گورنمنٹ کالج میں زیرِ تعلیم تھے تو حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کے علاوہ قریبی دوستوں میں خلیفہ صلاح الدین صاحب ممبر انکم ٹیکس ٹریبونل ابن خلیفہ شجاع الدین صاحب سپیکر پنجاب اسمبلی اور سید شمشاد حیدر شاہ صاحب رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی تھے۔ شاہ

صاحب علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے استاد شمس العلماء میر حسن کے پوتے تھے۔ اس کے علاوہ نامی گرامی شعراء کرام سے بہت قریبی تعلق تھا۔ اکثر جب کالج کے مشاعرہ وغیرہ میں آتے تو گھر پر بھی خوب رونق لگاتے۔ ان تمام دوستوں کی طبیعت مکرم والد صاحب کی سادگی اور تقویٰ کا بہت گہرا اثر تھا۔

آپ کو سلسلہ کی مختلف شاخوں میں کام کرنے کی توفیق ملی جس میں نمایاں طور پر ناظر بیت المال، سیکرٹری خلیفۃ المسیح الثالث، اور آخر میں صدر، صدر انجمن احمدیہ شامل ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے بے شمار دعاوں کو ہمارے حق میں قبول کرتا چلا جائے۔ آمین۔

☆☆☆

محترم شیخ محبوب عالم صاحب خالد کے اعزاز میں دی جانے والی الوداعی تقریب بتاریخ 7 مئی 1969

امجد اسلام امجد

سب رنگ کہانیاں

گزشتہ پندرہ برس میں جوان ہونے والی نسل نے اپنے بزرگوں سے "سب رنگ" ڈائجسٹ کا نام اور اُس کی مقبولیت کے قصے تو یقیناً سُنے ہوں گے مگر بچشمِ خود یہ رسالہ دیکھنے یا اس کے اوصاف سے آشنا ہونے کے باعث وہ عام طور پر اسے ان بزرگوں کے ناسٹیلجیا کا ایک ایسا حصہ ہی قیاس کرتی ہے جس کا کوئی تعلق اُن کی اپنی زندگیوں سے نہیں اور نہ ہی شاید وہ اُس انتظار اور بے صبری کا اندازہ کر سکتے ہیں جو اس کی ہر تازہ اشاعت سے قبل قارئین سے بار بار بُک اسٹالز کے چکر لگواتے تھے۔

اتفاق سے ہماری نسل نے اس کی ابتدا، فروغ، بے مثال مقبولت اور اشاعتی تسلسل کی کمی سے لے کر اس کے باقاعدہ بند ہونے کے تمام مرحلے صرف دیکھے ہی نہیں محسوس بھی کیے ہیں اور جہاں تک اس کے ایڈیٹر شکیل عادل زادہ کا تعلق ہے تو اُن کی ذاتی خصوصیات سے
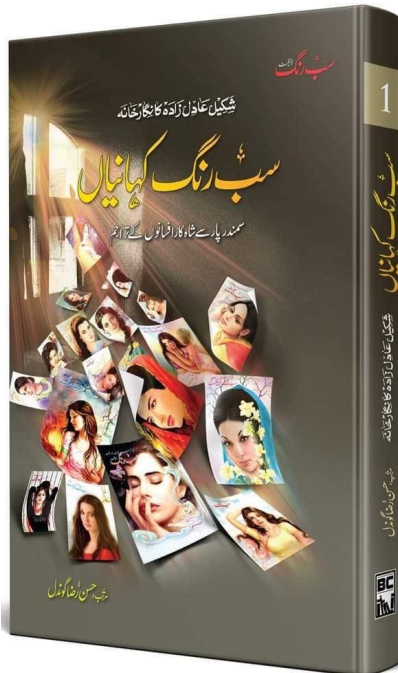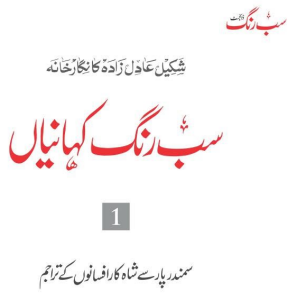
لے کر مدیرانہ جادوگریوں تک ہر چیز سے میں ذاتی طور پر واقف ہی نہیں ان کا دلدادہ بھی ہوں اور اب اُن سے ذاتی تعلقِ خاطر کو بھی چار دہائیوں سے اُوپر کا زمانہ ہو گیا ہے، اپنی تمام تر کاہلی اور کم آمیز فطرت کے باوجود اُن کو اپنے رشتے نبھانے کا ڈھنگ بہت اچھی طرح سے آتا ہے، سو وہ دوستوں سے ہمیشہ رابطے میں رہتے ہیں۔

''سب رنگ'' کیسے شروع ہوا اور کن کن منازل سے گزرا اس کا مختصر ساذکر انھوں نے اس کتاب ''سب رنگ کہانیاں'' کے دیباچے میں کیا تو ہے مگر اپنی طبیعت کے مخصوص ''انکسار'' کے باعث بہت سی کہنے والی باتیں ایک طرح سے گول بھی کر گئے ہیں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس کے ''مرتب'' حسن رضا گوندل نے اپنے تعارفی مضمون میں کئی ایسی باتوں کو بالواسطہ طریقے سے بیان کر دیا ہے اگرچہ ادبی، نیم ادبی، فلمی اور بعض دینی رسائل کے کچھ اور ایڈیٹروں نے بھی عوامی شہرت حاصل کی ہے لیکن ڈائجسٹوں کی حد تک شکیل عادل زادہ کا نام میرے نزدیک پہلے نمبر پر آتا ہے کہ کسی بھی ڈائجسٹ میں ایڈیٹر کی اُن جیسی بھرپور موجودگی کہیں بھی نظر نہیں آتی۔

وہ جس طرح اس کی ایک ایک کہانی بلکہ ایک ایک سطر کو دیکھتے، چُنتے اور سنوارتے تھے وہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اب جو حسن رضا گوندل، شکیل عادل زادہ اور بُک کارنر کے دوستوں نے مل کر اس بے مثال ڈائجسٹ میں شائع شدہ مختلف کہانیوں کے انتخابی مجموعے

داستان
در
داستان

شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے تو اُمید کی جا سکتی ہے کہ نہ صرف اس کے پُرانے قارئین اس کا کُھلی بانہوں سے استقبال کریں گے بلکہ نئی نسل کے لوگ بھی ان کے مطالعے کے بعد یہ جان سکیں گے کہ اُن کی بزرگ نسل کیوں اس کو اتنی محبت سے یاد کیا کرتی تھی۔ اس پہلی قسط میں تیس غیر ملکی کہانیوں کا ایک ایسا انتخاب شائع کیا گیا ہے کہ ہر کہانی پڑھنے کے بعد دل سے واہ نکلتی ہے "سب رنگ" اور شکیل عادل زادہ کے بارے میں آج کے چند بڑے ناموں نے جو توصیفی کلمات استعمال کیے ہیں اُن میں سے کچھ اس طرح ہیں۔

"میں نے کسی انٹرویو میں کہا تھا شکیل ہی نے "سب رنگ" نکال کے عالمی ڈائجسٹ کا پھندا میرے گلے میں ڈالا تھا... اس کتاب کے کئی ترجمہ نگار دوسرے ڈائجسٹوں کے لیے بھی کہانیاں ترجمہ کرتے تھے مگر دیکھئے "سب رنگ" میں ان کا کیا رنگ ہو جاتا تھا، افسوس سب رنگ جاری نہ رہ سکا مگر سچ تو یہ ہے کہ سب رنگ کے جتنے بھی شمارے چھپ سکے وہ تو یادگار شاہکار ہیں" (زاہدہ حنا)
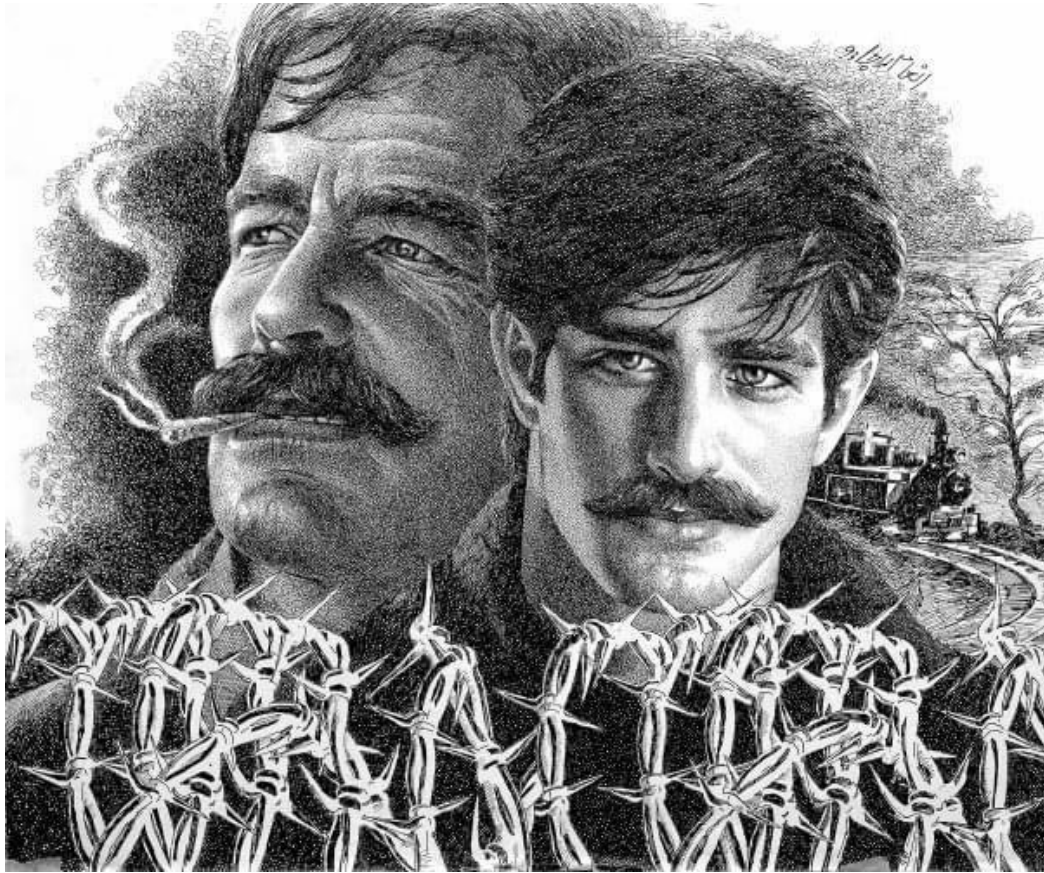
"اُردو اور دنیا بھر کے ادب سے چنیدہ کہانیوں کے انتخاب کا جو معیار جناب شکیل عادل زادہ کی ادارت میں شائع ہونے والے "سب رنگ ڈائجسٹ" کے اولین سے آخری شمارے تک قائم ہوا اس تک تاحال کوئی اور جریدہ پہنچ نہیں پایا، کسی ایک شمارے میں کبھی کوئی بھرتی کی کہانی شامل نہیں کی گئی، اس بلند ترین درجے کی پرکھ وہی مدیر کر سکتا تھا جو بذاتِ خود صاحبِ کمال ادیب ہو، قارئین کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کے عوض شکیل بھائی نے اپنی زندگی ہی میں بے پایاں محبتوں کے وہ خزانے سمیٹے ہیں جس کی مثال اُردو ادب میں نہیں ملتی۔ (محمد الیاس)

"سب رنگ ادبی رسائل و جرائد کا امام باقی سب مقتدی، ہم خوش نصیب ہیں کہ ہم نے ادب کے سنہرے دور، "دورِ سب رنگ" میں زندگی بسر کی سب رنگ میں شائع ہونے والی ہر کہانی، تحریر دمکتے ہیرے کی مانند اور شکیل عادل زادہ اُس کے جوہری ٹھہرے پس سب رنگ

شہر ادب کا دروازہ ہے (عرفان جاوید)۔

''شکیل عادل زادہ نے سب رنگ کے توسط سے کہانی کے فن کو نئی زندگی بخشی، انھوں نے دنیا کی تمام زبانوں سے کہانیاں چُن چُن کر سب رنگ میں شائع کیں اور خود بھی ایک لازوال اور دلچسپ کہانی ''بازی گر'' کے نام سے لکھی، دنیا میں ایسی مثال کم ہی ملے گی کہ کوئی ماہانہ رسالہ برسوں ڈیڑھ لاکھ کی تعداد میں شائع ہوتا رہا ہو، یہ معجزہ شکیل عادل زادہ نے کر دکھایا۔ مبارک ہو مبارک۔'' (انور خواجہ)

''جن لوگوں نے سب رنگ کا زمانہ نہیں دیکھا وہ اُس سچی تاہنگ کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے جو ہمارے من میں ہر شمارے کے لیے جاگا کرتی تھی، اس تاہنگ کا سبب اس ڈائجسٹ میں ہر بار ہاتھ لگنے والا عالمی ادب کا وہ انمول انتخاب تھا جو ہمیں عمر بھر کے لیے لفظ اور کہانی سے محبت سکھا گیا... حسن رضا گوندل نے سب رنگ کی وہ روشن روایت جو ماضی میں کہیں گم ہو رہی تھی اُسے پھر سے زندہ کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سب رنگ مین چھپنے والے شاہکار عالمی فکشن کو کتابی صورت میں دے کر شکیل عادل زادہ کے نگار خانے کا دریچہ آج کے قاری پر بھی کھول دیا ہے۔'' (محمد حمید شاہد)

''سب رنگ ہمارے افسانوی ادب کی تاریخ میں ایک عہد کا نام ہے، تخلیقی فکشن ہو، عالمی ادب سے مستعار لیے گئے افسانے یا قسط وار کہانیاں، سب رنگ کا انتخاب حرفِ آخر تھا جس نے افسانوی ادب پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد کے ذوق کی تربیت کی سب رنگ کی کہانیوں کی کلیات ایک اہم ادبی ورثے کو محفوظ کرنے کی قابلِ قدر کوشش ہے۔'' (اشرف شاد)

اُردو ادب میں شکیل عادل زادہ کی وہی حیثیت ہے جو زبانوں میں ابجد کی ہوتی ہے اُردو بہر حال اُن کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔'' (جاوید چودھری)

''سب رنگ کا نام آتے ہی ''بازی گر'' کے بٹھل، بابر زمان، کورا، ''جانگلوس'' کے رحیم داد اور لالی، قاضی عبدالستار اور چچا ابوالفضل صدیقی کی جادو بھری انگلیوں سے لکھی کہانیاں، دنیا بھر کے ادب کے شاندار تراجم اور پھر شکیل عادل زادہ کا ''ذاتی صفحہ'' یہ سب دل کو تڑپانے آجاتے ہیں، اُردو ادب کے رنگ ''سب رنگ'' کے بغیر پھیکے رہتے۔ '' (رؤف کلاسرا)

آخر میں اس کتاب کے حوالے سے حسن رضا گوندل، شکیل عادل زادہ اور بک کارنر والوں سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس سلسلے کو اُس وقت تک جاری رکھیے جب تک اس میں شائع شدہ ایک بھی کہانی باقی ہے۔

بشکریہ روزنامہ ایکسپریس ۳ ستمبر ۲۰۲۰

https://www.express.com.pk/epaper/PoPupwindow.aspx

☆☆☆
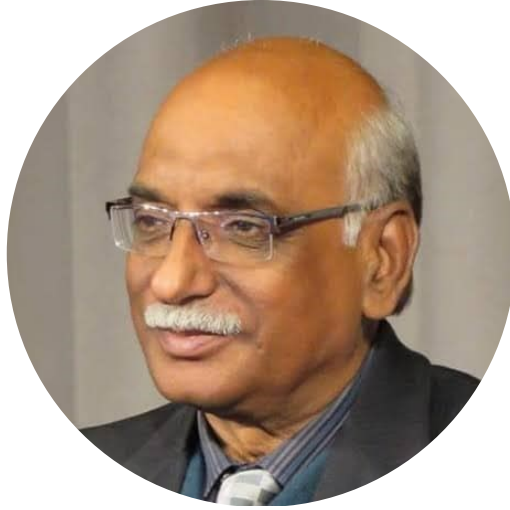
غلام حسین ساجد

تعارف کتاب۔ ''دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں'' : شاعر صابر ظفر

اس کی طاقت تو ظفر تم دیکھو
کتنی صنفوں کو غزل نے چھینا

صابر ظفر کا یکم جنوری 2020ء کو شائع ہونے والا یہ مجموعہ مجھے قبل از وقت مل گیا تھا اور اس تیز رفتاری نے مجھے منیر نیازی کی نظم "وقت توں اگّے لنگھن دی سزا" یاد دلا دی۔

"بندہ کلّارہ جاندا اے"

صابر ظفر بھی اپنے اس بیالیسویں مجموعے کے بعد اپنے ہم عصر غزل گوؤں میں اپنی طرز کا اکیلا آدمی ہے۔ اس نے غزل میں اتنے تجربات کیے ہیں کہ اس کی غزل اس کے اوپر نقل کیے گئے شعر کی مصداق ہر شعری صنف کا بدل بن گئی ہے اور زندگی کی ہر کیفیت اور تجربے پر محیط ہے۔ بحور، مضامین، اسلوب اور موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے اسے کسی کی مثل قرار دیا جا

سکتا ہے نہ اس کا کسی سے تقابل کیا جا سکتا ہے۔ وہ خیال کی ہر صورت اور فکر کی ہر پرت کو شعر بنانے پر قادر ہے اور داد و تحسین کی ہڑک سے بے نیاز ہے۔ اس عہد میں شاعری کو اسلوبِ حیات بنا کر اگر کسی نے زیست کی ہے تو صرف صابر ظفر نے کی ہے۔ اس کے اندر اس کے قد کے برابر نہیں اس کے تخیل کی ہم قد آگ ہے۔ اسی لیے وہ ہر طرح کے انتشار کو لپیٹ میں لے کر شعلوں میں بدلنے کا ہنر جانتا ہے۔ وہ اپنی لپیٹ میں آنے والے ہر خیال کو جلا کر پوِتر اور تابناک بناتا ہے اور اس میں دیر تک دہکنے کی ادا شامل کر کے اسے بے مثل بنا دیتا ہے جسے ہم جدیدیت یا فکری صباحت کا نام دیتے ہیں۔

کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے؟ کم از کم صابر ظفر کا مسئلہ نہیں کہ وہ الہام کی ہر دمک کو جذب کرنے اور اسے اپنا بنانے میں صرف سبک دست ہی نہیں، منفرد بھی ہے۔ اس لیے اس کے یہاں آہنگ کے انوکھے رنگ اور تجربات ملتے ہیں اور بعض اوقات قاری کو چکرا کر رکھ دیتے ہیں۔ میں ان کی ایسی ہر غزل کو رک کر اور آہنگ سے ہم آہنگ کر کے پڑھتا ہوں تو اس سے غزل کی سلطنت میں ایک خاص طرح کی کشادگی کا رنگ پیدا ہوتا محسوس ہوتا ہے جو غزل کی یکسانیت کو توڑنے میں بہت کام آتا ہے۔

فہیم شناس کاظمی نے اس کتاب پر بہت عمدہ دیباچہ لکھا ہے۔ انہوں نے کتاب کے نام کے حق میں دلیل دی ہے کہ "بارش جو تخلیق اور زندگی کی علامت ہے وہ چاک سے دیوار پر لکھے کے لیے پیامِ فنا ہے مگر اس دوران کا عرصہ جو وہ دیوار پر ہلکی سفیدی کے ساتھ اپنا پیغام اپنے ہم نفسوں کو دے رہا ہے وہ اسی درمیانی عرصے کو اپنی زندگی تصور کرتا ہے"۔

ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر مجھے اس کتاب کے نام سے حوالے سے یہ گمان گزرتا ہے کہ اندر ہی اندر کہیں شاعر کو اپنی تگ و دو کی رائگانی کا ڈر ہے اور کیوں نہ ہو کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ادب و شعر سے ہماری بے گانگی میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات خود مجھ پر بھی یہ کیفیت وارد ہوتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ لکھنا ترک کر کے کچھ اور دال دلیا کیا جائے، پھر بھی میں کہوں گا کہ صابر ظفر دیوار پر چاک سے نہیں چاقو کی نوک سے لکھا ہوا ہے۔ اسے مٹانے کے لیے غزل کی دیوار کو مٹانا ہوگا۔

گریہ بڑھا جو حد سے تو بے صبر چشم کو
ٹوکا قبول ہوتی دعا نے کہ خیریت؟

☆

یاد میں اس کی جلے آج بھی مقتل میں چراغ
ایک پروانۂ پارینہ جو وحشت سے جلا

☆

تیرے پیروں کی مٹّی سلامت رہے اے مرے پیش رو
تیری جائے شہادت ہے میرے لیے بندگی کی جگہ

☆

ملا ہے حکم کہ ہم بندگی بھی چھپ کے کریں
سو اپنی جائے نماز ایک جائے نامعلوم

☆

پیچھے رہ جائیں گے وہ، آگے نکل جاؤں گا میں
آنے والے جو شب و روز ہیں میرے آگے

☆☆☆

ڈاکٹر فہیم شناس کاظمی

بے انت سمے کا شاعر

صابر ظفر کے نئے مجموعہ کلام
۔۔۔۔دیوار پر چاک سے لکھا ہوں۔۔۔۔کا پیش لفظ

صابر ظفر، دھرتی کے بھاگ اور سہاگ کا شاعر ہے اُس کی شاعری جذبوں، محبتوں اور علامتوں کا ایک دریا ہے، ایک ایسا دریا ہے جو اپنی دھرتی کے موسموں اور لوگوں کے دُکھ سُکھ اور عصری صداقتوں سے آشنا ہے وہ انت سے بے انت کی سمت سفر کرتا ہے:

بے انت سمے کا ایک شاعر
خلّاقِ خیال ماورا ہے

اس میں حرارت و توانائی ہے اس کی شاعری برکتوں کے موسم میں کھلنے والے پھولوں، شاداب فصلوں کی سرزمین کا منظر ہے وہ اپنے دریائے سخن کے دونوں کناروں کو زرخیز بناتا اپنی منزل کی سمت رواں دواں ہے وہ اپنی لہر لہر کے سُر تال، نرت بھاؤ، اُتار چڑھاؤ پر گہری نظر رکھتا ہے یہ اُس کی فنی کاملیت اور دھرتی سے شدید ترین محبت کی دلیل ہے وہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک بار نہیں بار بار ہے یعنی آس پاس چار اطراف، مشرق و مغرب، جنوب و شمال سب اُس کے دم سے اُس کی زندگی سے جُڑے ہوئے (نتھّی) ہیں۔ ایسے نتھّی کہ ایک دوسرے کے بغیر دونوں نامکمل اور ادھورے ہیں اور یہ احساس عدم تکمیلیت اور ہست و بود سے ماورا کر کے ایک "ھُو" سے "حق موجود" کی سمت لاتا ہے:

کہا گیا تھا جو کُن، اوّلیں وہ تھی آواز
پکارا جانا ہے محشر میں، دوسری آواز

وہ احساسِ محبت کی فراوانی سے مالامال موجود و لاموجود سے بے نیازی اور گہری قربت کے اسرار و رموز کا شاعر ہے وہ شاعرِ ہجر و وصال ہے:

پھول تکیے پہ جو کاڑھے ہیں وہ کِھل اُٹھّیں گے
اُن کی خوشبو سے ہی سوئے ہوئے دِل اُٹھّیں گے

اور شاعرِ فراق بھی، محبت اور زندگی اس کی شاعری کی اساس ہیں نظم ہوتی تو شاید اُسے اپنا مافی الضمیر کہنے میں، احساس کی نازک ترین کیفیات بیان کرنے میں آسانی ہوتی مگر صابر ظفر وہ باکمال شاعر ہے اُس نے غالب کے اس نقطۂ نظر:

کچھ اور چاہیے وسعت مِرے بیاں کے لیے

کے بجائے میرؔ کی اتباع کی:

درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

اور ایک دو نہیں بیالیس دیوان، جس میں زندگی کے تمام درد و غم کو تمام حیات و کائنات کو سمو لیا اور ایسی حُسن کاری، تازگی،

جدّت وندرت کے ساتھ نہ اُس کے تمام ہم عصر، ماہرینِ فن اساتذہ کرام اور ایک زمانہ عش عش کر اُٹھے مگر وہ داد و دہش سے بے نیاز آج بھی سر گرمِ سخن ہے اور ایک کے بعد ایک نئے سے نئے موضوع کے ظاہر و باطن، جلی و خفی، اسرار و رموز، جہانِ گم گشتہ کی بازیافت کرتا چلا جارہا ہے چاہے وہ لسانی تجربات ہوں کہ فنی کمالات، انکشافاتِ کائنات ہو کہ کربِ ذات، تغیراتِ ظاہری ہوں کہ باطنی، وہ ہر ناممکن کو ممکن اور ہر گماں کو یقیں بناتا چلا جارہا ہے،

فراق گورکھپوری نے غزل کے باب میں کہا تھا کہ:

"غزل انتہاؤں کا ایک سلسلہ ہے یعنی (Aseries of Climaxex) گویا حیات و کائنات کے وہ مرکزی حقائق جو انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرتے ہیں تاثرات کی انہی انتہاؤں یا منتہاؤں کا مترنم خیالات و محسوسات بن جانا اور مناسب ترین یا موزوں ترین الفاظ و انداز و بیان میں ان کی صورت پکڑ لینا، اسی کا نام غزل ہے۔"

(حوالہ: فراق گورکھپوری، نگار پاکستان، کراچی،

صابر ظفر کی غزل اُردو کی جدید غزل ہے جس غزل سے مَیں صابر ظفر سے پہلی بار شناسا ہُوا، وہ یہ تھی:

دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے
اگرچہ بولتا کوئی نہیں ہے
مَیں ایسے جمگھٹے میں کھو گیا ہُوں
جہاں میرے سِوا کوئی نہیں ہے
رکوں تو منزلیں ہی منزلیں ہیں
چلوں تو راستا کوئی نہیں ہے
کُھلی ہیں کھڑکیاں ہر گھر کی لیکن
گلی میں جھانکتا کوئی نہیں ہے
کسی سے آشنا ایسا ہُوا ہُوں
مجھے پہچانتا کوئی نہیں ہے

اس غزل کا ہر شعر نو آبادیاتی ظلم و ستم کا شکار عصری منظر نامے کے ساتھ ساتھ معاشرتی تغیرات اور عمومی بے حسی اور بے بسی کی فضا کی عکاسی کرتا ہے مگر پہلی سطح پر ایک رومان، دل کشی اور شعریت ہے ایک اثریت اور جاذبیت ہے آپ یہ غزل پڑھیں یا سُنیں ہر دو سطح پر یہ روح و دل میں اُترتی چلی جاتی ہے اس غزل میں ہماری آج کی وہ بے گانگی اور بے حسی کی صورتِ حال ہے جس سے ہم ہر روز گزرتے ہیں جو ہمارے چہار اطراف بھیانک آسیب کی طرح پھیلی ہوئی ہے ایسے موقع پر شاعر کی ذمے داری اور بڑھ جاتی ہے۔ سارتر کہتا ہے کہ:

"ادیب کو چاہیے کہ اپنے عہد کے لیے لکھے، عظیم ادیبوں نے یہی کیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادیب خود کو اپنے عہد میں مقید کر لے، اپنے عہد کے لیے لکھنے کا مطلب عہد کی انفعالی طور پر عکاسی کرنا نہیں بلکہ اس کے بر خلاف اُسے برقرار رکھنے یا بدل دینے کی شعوری کوشش ہے یوں ادیب اپنے عہد سے آگے مستقبل کی سمت قدم بڑھاتا ہے، اپنے عہد کو بدل دینے کی کوشش، ہماری جڑیں، اپنے عہد میں اور مضبوط کر دیتی ہے اس لیے کہ عہد متحرک ہے اس کو مُردہ آلات یا رسومات بنا کر منجمد نہیں کیا جاسکتا۔"

(حوالہ: ژاں پال سارتر (ترجمہ: فاخر حُسین)، ادب، فلسفہ وجودیت، نگارشات، لاہور 1992ء، صفحہ 119)

اسی مضمون میں سارتر آخر میں کہتا ہے کہ:

”ادیب کی قدر کے لیے یہ پیمانہ رکھتے ہیں کہ اس کی تصانیف پڑھ کر جب تک لوگوں کو غصہ آئے گا، بے چینی ہوگی، شرم آئے گی، نفرت ہوگی، محبت ہوگی وہ زندہ رہے گا۔“

یعنی تخلیقی تحریر ہمیں نہ صرف اپنے عہد سے جوڑے گی بلکہ اُسے بہترین سازگار ماحول میں تبدیل کرنے پر اُکسائے گی، ہمارے اندر خود اپنے وجود کی جذباتی سطحیت اور اندرونی خلفشار، کش مکش اور فیصلوں کو آسان بنائے گی، ہمارے جذبات میں غمی یا خوشی کا ایک ہیجان برپا کرے گی، ہمیں اس سے نفرت یا محبت ہوگی تو جناب یہی تو زندگی کی قدر اور اقدار کی اساس ہے ظاہری اور باطنی اضطراب اور احساسات و جذبات سے ہم اور ہمارا وجود عبارت ہے۔

صابر ظفر کے نئے مجموعہ کلام ”دیوار پہ چاک سے لکھا ہُوں“ میں رنگ اور رُخ بدلتی جدید سے جدید تر ہوتی زندگی کا وہ منظر نامہ ہے جس کی سمت سارتر نے اشارہ کیا ہے اگر مَیں اس موقع پر یہ کہوں کہ ہم اکیسویں صدی میں بھی ”جدید تر نوآبادیاتی آمریت“ کے مقابل ہیں جو دونوں سطحوں اندرونی اور بیرونی سطح پر قائم ہے تو یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ اس میں کسی حد تک اظہارِ جذبات کی آزادی ہے اس کے بعد ایک طویل گم شدگی یا ہمیشہ کی چپ، ایسے عالم میں دیوار پہ چاک سے لکھا ہُوا ہونا بھی عزم و ہمت اور بے پایاں حوصلے کی علامت ہے کہ جب ہمیں انجام بھی معلوم ہے:

ڈھل جاؤں گا اگلی بارشوں میں
دیوار پہ چاک سے لکھا ہُوں

بارش جو تخلیق اور زندگی کی علامت ہے وہ چاک سے دیوار پر لکھے کے لیے پیامِ فنا ہے مگر اس دوران کا عرصہ جو وہ دیوار پہ ہلکی سفیدی کے ساتھ اپنا پیغام اپنے ہم نفسوں کو دے رہا ہے وہ اِسی درمیانی عرصے کو اپنی زندگی تصور کرتا ہے۔

یہاں یہ امر دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ صابر ظفر نے اپنے پہلے شعری مجموعے ”ابتدا“ کا آغاز اس غزل سے کیا تھا:

یہ سوچ کے راکھ ہو گیا ہُوں
مَیں شام سے صبح تک جَلا ہُوں
ڈھل جاؤں گا اگلی بارشوں میں
دیوار پہ چاک سے لکھا ہُوں

اب 46 سال بعد صابر ظفر نے اپنے 42ویں شعری مجموعے کی پہلی غزل کی ابتدا بھی ”ابتدا“ کی پہلی غزل ہی کی زمین سے کی ہے:

اتنا تو وصال آشنا ہُوں
مَیں تیرے خیال سے جُڑا ہُوں
بہتر تھا کہ غیب میں سماتا
مَیں اپنے وجود کی سزا ہُوں

یہ شعری مجموعہ ہمیں ایسے شعور اور اعلیٰ ترین خیالات سے نوازنے کے لیے اشاعت پذیر ہو رہا ہے جس سے فکر و ادراک اور آیندہ کی نسلِ انسانی کو اس عہد کی تاریخ اور شعوری کش مکش کی روداد اور انسانی مستقبل کے لیے اس عہد کے انسان کی قربانی کا اندازہ ہوگا۔

آج صابر ظفر جس مقام پر ہے اور جس طرح وہ اُردو غزل کی کایا اس کا اندرون و بیرون بدلتا جا رہا ہے وہ بلاشبہ ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے اس عہد میں ظفر اقبال سمیت کوئی شاعر بھی اس کے ہم پلّہ نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کیوں کہ ایسے اور اتنے تجربات اور ایسی

شاعری کے لیے آپ کو اپنے آپ سے دست بردار ہونا پڑے گا:

پیچھے رہ جائیں گے وہ، آگے نکل جاؤں گا مَیں
آنے والے جو شب و روز ہیں میرے آگے

صابر ظفر کی شاعری میں احتجاج، بغاوت، احساس اور دردمندی، جرأت و ہمت، محبت اور صداقت کا نور ہے جس کی روشنی سے اُردو غزل کا وجود سرشار ہو رہا ہے بقول ڈاکٹر مبارک علی: "عوام کو مزاحمت سمجھانے کے لیے مزاحمت کے سِوا کوئی چارہ نہیں":

اگر ہمارے لہو سے کہیں، زمیں بھیگے
تو یہ سمجھنا، سبھی سوکھے لب وہیں بھیگے

☆

ڈوبے ہیں جو لہو میں وہ پیکر نہ بیچیو
نیناں ہمارے کھائیو، منظر نہ بیچیو

☆

خوف آتا ہے یزیدوں سے تو گھر کو چلیے
کربلا ورنہ پکارے تو اُدھر کو چلیے

☆

شہیدوں سے سخن کا عہد کر لے
پھر اُن کی خاکِ پا سے زخم بھر لے

☆

وہ نور آنکھوں سے، جسموں سے جان کھینچتے ہیں
جو بولیں ہم تو ہماری زبان کھینچتے ہیں

☆

ہمارے شہر اجل زاد ہو کے رہ گئے ہیں
دمشق و کوفہ و بغداد ہو کے رہ گئے ہیں

☆

لہو کی لہر کو بل کھاتے دُور تک دیکھا
پلٹ کے دیکھا وطن تو سسک سسک دیکھا

☆

تمھارے زخم بھرے گی تمھاری آزادی
وگرنہ یوں ہی رہے گی لہو بھری وادی

☆

اک عمر جو ہم نے خون تھوکا
دل نرم نہیں ہُوا کسو کا

☆

دل رہا ڈوبا لہو میں اور ہم لکھتے رہے
یعنی مقبوضہ علاقوں کا الم لکھتے رہے
ہاتھ اُن اہلِ قلم کے کر دیے جائیں قلم
قتل گاہوں کو ظفرؔ جو آشرم لکھتے رہے

☆

مَیں، جدت و ندرت اور تخلیقیت کے اوصاف سے متصّف اس مجموعے (دیوار پر چاک سے لکھا ہوں) کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے منتظر ہوں جس کی ادائی کی نوید ہے، اس نعت کی مہک، آتشِ شوق کو فزوں تر کیے جا رہی ہے۔

☆☆☆

صابر ظفر کے مطبوعہ شعری مجموعے

1-ابتدا
2-دھواں اور پھول
3-پاتال
4-جتنی آنکھیں اچھی ہوں گی
5-دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے
6-لہوترنگ
7-دکھوں کی چادر
8-بارہ دری میں شام
9-عشق میں روگ ہزار
10-ایک تری یاد رہ گئی باقی
11-بے آہٹ چلی آتی ہے موت
12-چین اک پل نہیں
13-اپنے رنگوں میں ڈوب جانے دے
14-محبّت کا نیل کنٹھ
15-کوئی لو چراغ قدیم کی
16-نامعلوم
17-پرندوں کی طرح شامیں
18-محبّت دور کی آواز تھی
19-سانول موڑ مہاراں
20-زندان میں زندگی امر ہے
21-خاموش بدن کی خود کلامی
22-ہر چیز کلام کر رہی ہے
23-ستارہ وار سخن
24-آئینوں کی راہداریاں
25-اباسین کے کنارے
26-غزل خطاطی
27-صندل کی طرح سلگتے رہنا
28-سب اپنے خیال کی دھنک ہے
29-غزل اندر غزل
30-گردش مرثیہ
31-پلکوں میں پروئی ہوئی رات
32-سر بازار می رقصم
33-جمال ماورا جسم و جاں
34-رانجھا تخت ہزارے کا
35-اساطیر کم نما
36-آوارگی کے پر کھلے
37-غزل نے کہا
38-لہو سے دستخط
39۔شہادت نامہ
40۔روحِ قدیم کی قسم
41۔ آواز کی لہر پر چلا میں
42۔دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں
43۔جمالِ آب سے وصال

☆☆☆

غزلیات

صابر ظفر

نہ میں خاک پر ، نہ میں چاک پر ، مرے کوزہ گر
میں کہاں ہوں گم، مجھے دے خبر ، مرے کوزہ گر

میں بہار اور خزاں سے قدرے الگ بھی ہوں
مرے موسموں سے کبھی گزر ، مرے کوزہ گر

مجھے خاک داں میں زیادہ دیر نہ قید رکھ
بڑی دور کا ہے مرا سفر ، مرے کوزہ گر

ہے خمیر میں یہ ترا ہی گیت بھرا ہوا
میں بجا رہا ہوں گھڑا اگر ، مرے کوزہ گر

جو بنایا ریت سے کوزہ وہ تو بکھر گیا
چلو نام لکھتے ہیں ریت پر ، مرے کوزہ گر

میں یہاں نہیں، میں وہاں نہیں، میں کہیں نہیں
مرے ہونے ہی سے نہ تو مکر ، مرے کوزہ گر

مری ساری عمر کٹی ہے اس کو سمیٹتے
ہے مرا گزارہ ہی خاک پر ، مرے کوزہ گر

ترے سارے کوزے مری طرح کوئی توڑ دے
تجھے دیکھوں اپنا بھی نوحہ گر ، مرے کوزہ گر

نہیں منتوں کے بغیر ملتی یہاں مراد
کہیں تو بھی کوئی پیالہ بھر ، مرے کوزہ گر

ابھی رہنے دے مجھے مست اپنی ترنگ میں
ابھی گردشوں سے نہ کر حذر ، مرے کوزہ گر

مرے روپ ہی سے عیاں کبھی ترا روپ ہو
مری خاک ہی سے کبھی ابھر ، مرے کوزہ گر

نہ بنوں میں ویسے ، بنانا چاہے تو جس طرح
رہوں تیرے پاس میں عمر بھر ، مرے کوزہ گر

مرے خشک و تر میں اگر ترا کوئی دخل ہے
مرے ساتھ جی ، مرے ساتھ مر ، مرے کوزہ گر

مرے جسم ہی کو فقط بنا نہ تو روغنی
مری روح میں بھی کبھی اتر ، مرے کوزہ گر

کئی گردشوں کی ابھی اسے ہے ضرورت اور
مری داستاں ہے طویل تر ، مرے کوزہ گر

سدا جس نے ڈھانپا برہنگی کے عیوب کو
وہ لباسِ خاک کی تھی کتر ، مرے کوزہ گر

زرِ خاک چھیننا اور پھر اس کو اجاڑنا
یہ سب اہلِ خاک ہی کا ہے شر ، مرے کوزہ گر

مجھے بار بار صدائیں دیتی ہے میری خاک
ذرا آ ادھر مرے کوزہ گر ، مرے کوزہ گر

تری سمت بیر بہوٹی کوئی جو آئی ہے
اسے پیش عشق پیالہ کر ، مرے کوزہ گر

ابھی اصل شکل ہی شاید اس کو نہیں ملی
ابھی منتظر ہے ترا ظفر ، مرے کوزہ گر

☆☆☆

مبارک عابد

ساقی آج شام پینے والے دور دور ہیں
میکدے میں مے کشوں سے پیالے دور دور ہیں

دل اگر کشادہ ہے تو ہرطرف ہیں وسعتیں
دیپ طاقچے میں ہے اجالے دور دور ہیں

دن ہوا اجاڑ سا تو رات بھی پہاڑ سی
بے بسی نے آج ڈیرے ڈالے دور دور ہیں

دل حویلی میں کبھی کوئی آیا نہ گیا
ہر طرف پڑے ہوئے جالے دور دور ہیں

اس کے پاسباں ہیں یہ سایہ ء جمال بھی
چاند کے قریب ہیں کہ ہالے دور دور ہیں

آب و دانہ کھینچ کر پار دیس لے گیا
ہم نے لاڈ پیار سے جو پالے دور دور ہیں

بلبلوں کو حکم ہے کہ آشیانوں میں رہیں
پہنچے ان کے گیت اور نالے دور دور ہیں

☆☆☆

محمد خالد

عشق میں اب کے ہمیں جاں سے گزرنا بھی تو ہے
کام ہونے کا نہیں کام یہ کرنا بھی تو ہے

اور پھر سامنے ہے خاک نشینوں کا جہاں
یہ قدم ہم نے کسی خاک پہ دھرنا بھی تو ہے

اور اک کام نکل آتا ہے ہر کام کے بیچ
ہمیں جینا ہی نہیں ہے ہمیں مرنا بھی تو ہے

شہر میں اور بھی ہوگا کوئی خوش خو تجھ سا
آخر کار تیرے زخموں نے بھرنا بھی تو ہے

ہم سے بے مایہ ہی تقدیر ہیں اس عالم کی
خاک نے چہرۂ دوراں پہ بکھرنا بھی تو ہے

نہیں ایسا بھی جری کوئی مگر اس دل نے
کسی اندیشۂ بے نام سے ڈرنا بھی تو ہے

جب یہ طے ہے کہ نہیں لوٹ کے آنا ہم کو
ڈوبنا ہے تو کہیں پار اترنا بھی تو ہے

☆

پھر کوئی خواب ترے رنگوں سے جدا نہیں دیکھا
کیا کچھ دیکھ لیا تھا ہم نے کیا نہیں دیکھا

اول عشق کی ساعت جا کر پھر نہیں آئی
پھر کوئی موسم پہلے موسم سا نہیں دیکھا

سب نے دیکھا تھا ترا ہم کو رخصت کرنا
ہم نے جو منظر دیکھنے والا تھا نہیں دیکھا

بے کل بے کل رہنا دید کا پھل تو نہیں ہے
دیکھنے والی آنکھ نے جانے کیا نہیں دیکھا

ہم جسے پردۂ خواب میں رہ کر دیکھ رہے ہیں
جاگنے والو تم نے بھی دیکھا یا نہیں دیکھا

☆☆☆

احمد مبارک

باغوں کو جائیں گھومنے ، ساحِل بحال ہوں
ٹَل جائے یہ بلا تو مشاغل بحال ہوں

سب ایک دوسرے کے مقابل بحال ہوں
لیکن خدا کرے کہ نہ قاتل بحال ہوں

کب تک پڑیں رہیں گے گھروں پر یہ زندہ لوگ
رستے کھلیں سفر کی منازل بحال ہوں

گریہ کُناں ہے سارے کا سارا چمن کہ کب
تیرے گُلاب تیرے عنادل بحال ہوں

ہو اذنِ باریابیٔ بابِ قبولیت
پھر دستکیں سُنائی دیں سائل بحال ہوں

نکلی ہے ایک راہ پسِ راہ گذارِ ہجر
لگتا تھا یہ جو ربط ہیں مشکل بحال ہوں

کب جمع آن ہوں گے مرے یارِ خوش سُخن
احوالِ دل سُنیں تو ذرا دِل بحال ہوں

☆☆☆

راجہ محمد یوسف

مُضطرِب ، بے کل ، سراپا جستجو ، بِکھرا ہوا
ڈھونڈتا پھرتا ہوں تجھ کو کُوبکُو ، بِکھرا ہوا

روز اِک امید کی تازہ کِرن کے شوق میں
روز ہوتا ہوں کِسی کے رُوبرو بِکھرا ہوا

امتحاں در امتحاں درامتحاں در امتحاں
ہر قدم پر منتظِر اِک فتنہ خُو بِکھرا ہوا

دیکھتا رہتا ہوں شب بھر جاگتی آنکھوں سے خواب
پا بجولاں میں اسیر آرزو ، بِکھرا ہوا

اِس قدر اُلجھا ہوا ہوں گردشِ حالات میں
دیکھتا ہوں دُور سے جام و سبو ، بِکھرا ہوا

ناصر جمیل

شامِ فُرقت نہ شبِ ہجر کا درماں جاناں
' ہم نے جیسے بھی بسر کی ترا احساں جاناں'

ایک عالم کو بشارت تری رحمت کی تھی
ایک عالم ترے لوگوں سے پریشاں جاناں

ہر کوئی ہاتھ میں تلوار لیے پھرتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی مذہب سے ہراساں جانا

کانپ اُٹھتی ہے زمیں اپنی ہی سرگوشی سے
آسماں اپنے ہی لہجے سے گریزاں جاناں

کوئی خواب آنکھ میں رکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے
وقت کے سیل میں بہہ جاتے ہیں انساں جاناں

پوچھیۓ مت مشغلہ کیا ہے مریضِ ہجر کا
دامنِ صد چاک کرتا ہے رفو بکھرا ہوا

کِس قدر پُرکیف ہے اِک موجۂ بادِ صبا
یار کی زلفوں سے ہو کر مُشکبو ، بکھرا ہوا

ایک عالم گوش بر آواز سنتا ہے مجھے
وجد میں آکر کروں جب گفتگو بکھرا ہوا

پھر دلِ بے تاب میں یوسّف کوئی طوفان ہے
آئینے میں دیکھتا ہوں عکسِ رُو بِکھرا ہوا

☆☆☆

DR. AFTAB HUSAIN

A hardcore perfectionist!

Muhammad Khalid is a poet who sticks to his poetic truth -- at the cost of remaining lesser known

"I can wait, I can think, I can fast." This is how Siddhartha, the eponymous protagonist in Herman Hesse's novelette replies when he is asked by his female counterpart, Kamla, to show what he possesses to offer against her carnal charms. This trinity of virtues -- waiting, thinking and fasting -- is a prerequisite not only for an ascetic or a recluse, an artist too, is expected to display a certain degree of restraint, patience and self-containment.

But have you ever come across a writer or a poet who is a staunch believer of the significance of poetry in human existence, who has spent a major part of life in a literary hub of the country, who has been publishing in almost every major literary magazine and who is unanimously considered by his readers as one of the most distinguished voices in the contemporary Urdu ghazal, who has already been superannuated as principal of a postgraduate college at Lahore, who always has good publishers at his disposal - and yet, after all his achievements, his maiden collection of poetry is still to be published? Well, I know one such person.

Muhammad Khalid emerged on the horizon of Urdu ghazal in the 1970s, alongside an army of poets, including Irfan Siddiqui and Sarwat Husain. Some of them found instant fame, courtesy the *mushaira* industry, others took a rather sober start and soon fell victim to experimentation. Both of these types have already been passé and sidelined, if not completely removed by the fresh contenders. But the impact of the trio - Khalid, Siddique and Husain -- mentioned above is felt in the contemporary milieu

MUHAMMAD KHALID

of Urdu ghazal even today.

A powerful poet with a strong poetic enunciation, Irfan Siddiqui is arguably the only poet that emerged on the post-partition Urdu ghazal scene in India. He was well-received both at critical and popular levels. However, Siddiqui is too deeply entrenched in the classical tradition to produce a salience of his own.

Khalid regards poetry as an antidote to the fatal impact of consumerism. He touches on the sociopolitical realities of his age, but these issues are so merged into his poetic aesthetics that he cannot be called a poet of social realism.

Sarwat Husain too did not deviate from the classical mannerism. Nevertheless, his ghazal offers a remarkable freshness both in its thematic mosaic and in imagery. He now has a cult status among the contemporary poets, not only for his radical methods of coping with love and life but also for his tragic end. In 1996, Husain took his life by throwing himself in front of a passing train in Karachi.

Neither Siddiqui nor Husain pose any challenge of comprehension to their readers - in either their thought pattern or in their mode of expression. But Khalid's ghazal style is somewhere between that of Siddiqui and Husain's - a bit more modern than the former but less radical than the latter. It is vague and dense and, therefore, largely inaccessible. Despite the fact that his name is not sufficiently known to the common reader of contemporary Urdu ghazal, he is much revered by both his own generation and the ones that followed - many of them; Ghulam Hussain Sajid, Abrar Ahmad, Akram Mahmood, Afzal Naveed, Aftab Husain and Zia ul Hassan, to name only a few, are clearly influenced by and indebted to his system. Still, the overall aura of Khalid's ghazal and his sophistication is something hard to imitate.

Khalid is not an advocate of poetry that is devoid of sociocultural responsibilities. On the contrary, he regards poetry as an antidote to the fatal impact of consumerism. He touches on the sociopolitical realities of his age, but these issues are so merged into his poetic aesthetics that he cannot be called a poet of social realism. Khalid is, in fact, more interested in the general human condition from a wider perspective and at a deeper level. He resists diluting the basic flavour of his ghazal in oversimplified statements and naïve realism.

Put in undertones, Khalid's poetry offers a world - dim in outline - that fascinates you but at the same time, challenges your facile modes of reading. You will find no stock cluster of images - except the recurrent motif of 'dream' that is again problematically fluid. Should we look at him as an anti-imagist poet? No. He does create images, but his images are more of sketchy gestalts than fully developed pictures. There remains a lot unsaid; a number of blank points he deliberately leaves to the imagination of his reader.

It is clear that Khalid is a poet not meant for the common public. Even then, his ghazals are eagerly sought after by those with a cultivated taste for refined poetry. But his poetry is not easily available, which is frustrating for his readers.

Some responsibility for this inaccessibility lies with the poet himself for not putting any effort in publishing a collection of his own poetry. As for his disinclination, some of his literary colleagues hold that as he did not publish his book well in time, he fears now that it might not yield the expected results. This perception is based on the viewpoint that genuine poetry has its instant appeal, in other words, a poet's job is to startle his reader.

Khalid, however, does not seem to subscribe to this definition.

Koi HameN Pahchan Le, YuuN Tau Mushkil Hay

Lekin, Ham Is Bheer MeiN Kho Bhi NaheeN Sakte

[Hard that someone is there that come and recognise us

But surely, we are not to remain unrecognised in this mob.]

In an era when most of our poets are swayed by the allures of media and succumb to the dictates of the market economy, it is heartening to see somebody sticking to his poetic self - even at the cost of remaining less known.

(**First published in The News International Source:** https://www.thenews.com.pk/tns/detail/568044-hardcore-perfectionist-2 , June 30, 2019

The writer is a Pakistan-born and Austria-based poet in Urdu and English. He teaches South Asian Literature & Culture at Vienna University.

اجوکی پنجابی نثر

تماہی ''سانجھ'' وچ چھپن والیاں لکھتاں دی چون

سودھی: سفیر رامہ، اعجاز

سانجھ SANJH PUBLICATIONS

اجوکی پنجابی نثر

سودھی: سفیر رامہ، اعجاز

سانجھ SANJH PUBLICATIONS

سانجھ رسالے دے چیف ایڈیٹر سفیر رامہ ہوریں امریکہ رہندے نیں تے پنجابی دے جانے پچھانے کامے نیں۔ کافی چرتوں پنجابی دی بھرویں تے جگ وچ سب توں مشہور ویب سایٹ اپنا آرگ (apnaorg.com) دے ناں توں چلا رہے نیں۔ پنجابی بارے ایہناں دیاں لکھتاں امریکہ تے پاکستان دے اخباراں رسالیاں وچ چھپدیاں رہندیاں نیں۔ امریکہ وچ پنجابی دی تگڑی تنظیم اپنا (Academy of the Punjab in North America) دے مُڈھلے ممبر تے کوآرڈینیٹر (Coordinator) نیں۔

اعجاز دا جنم 25 فروری 1990ء کھرڑیانوالہ، لائل پور (فیصل آباد) دا اے۔ اوہناں دیاں چھپتاں وچ ''رَڑے دارُکھ 2010ء''، ''بے برکتے دناں دی کتھا 2015ء'' اَتے لوہاور 2017'' ناں دیاں کتاباں شامل ہَن۔ اوہ نظم تے نثر دوواں کھیتراں وچ لکھن دی یکساں قدرت رکھدے نیں۔ اوہ اجکل بطور پنجابی لیکچرار سرور شہید (نشان حیدر) گورنمنٹ ڈگری کالج گوجرخان، راولپنڈی وچ پڑھا رہے نیں۔ اوہ لائل پور توں پنجابی اکھراں وچ چھپ رہے لڑی وار پرچے ''ققنس'' دے ایڈیٹر نیں۔ ایس توں اڈ اوہ آپنا اک آن لائن پنجابی پیپر ''انہد'' دے ناں توں وی چلا رہے نیں۔

سانجھ SANJH PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 3314686276
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com

ISBN: 978-969-593-287-2
9 789695 932872

Book: "Ajoki Punjabi Nasr"

Mushtaq Soofi, Dawn : September 16, 2019

"Ajoki Punjabi Nasar [Contemporary Punjabi Prose]", a valuable book compiled by Safir Rammah and Ijaz, has been published by Sanjh Publications, Lahore. It's in fact a selection of prose writings which appeared in the quarterly literary journal 'Sanjh' from 2007 to 2010.

The journal was brought out by Safir Rammah and his friends simultaneously from Lahore and Ludhiana in Gurmukhi and Shahmukhi scripts. It was seemingly a serious intellectual and cultural effort to provide a literary platform to what is now called three Punjabs; East and West Punjab, and diaspora which is quite sizable. The journal was a literary means to build bridges between the three.

Safir Rammah, based in the USA, is a well-known and respected language rights activist and cultural figure, who manages one of the largest websites exclusively dedicated to promoting Punjabi language, liter-

ature and music.

Ijaz is a young upcoming writer with promise who already has a number of books to his credit. The contents of the book have been divided into different segments such as Punjab, Punjabi and Punjabiatt [Punjabihood], history, short stories, travelogues and obituaries. The first segment carries articles on Punjabi language, linguistic conundrum in the region, South Asian culture, Heer Waris and compositions of the legend of Heer during the Sikh rule by prominent authors.

In the history we have Chaman Lal's well-researched article on Bhagat Singh's revolutionary heritage translated by Waseem Ramay and Ibrar Mazhar. There is another worth reading article by prominent poet, author and researcher Ahmed Saleem on Bradlaugh Hall in Lahore which emerged as a centre of anti-colonial struggle in Punjab and North India. All the bigwigs of the 20th century politics including Bhagat Singh, Jinnah, Gandhi and Nehru had something to do with this great historical hall which is almost in ruins due to official neglect. There is yet another interesting article on whether Alexander was the winner of the great Battle of Hydaspes translated by Asif Raza from Sindhi. Highly illuminating is the segment that carries obituaries and biographical notes on the artists and writers who are no longer with us.

Who can miss something serious written on Amrita Sher Gill, Noor Jahan, Shiv Kumar and Munir Niazi. 'Ajoki Punjabi Nasar" must on your shelf if you are interested in literature, art and history. The compilers/editors deserve accolades for the job well done.
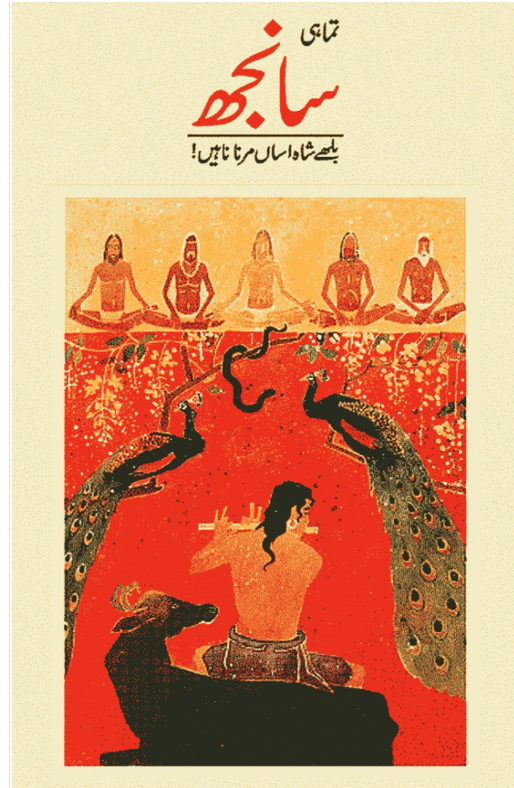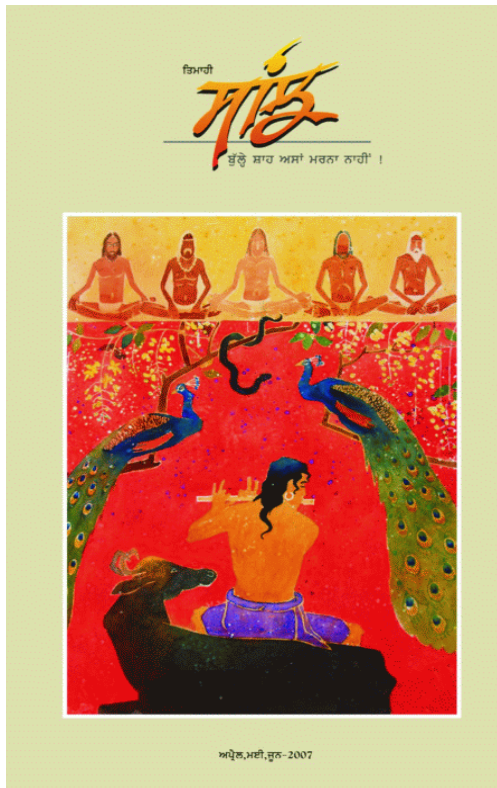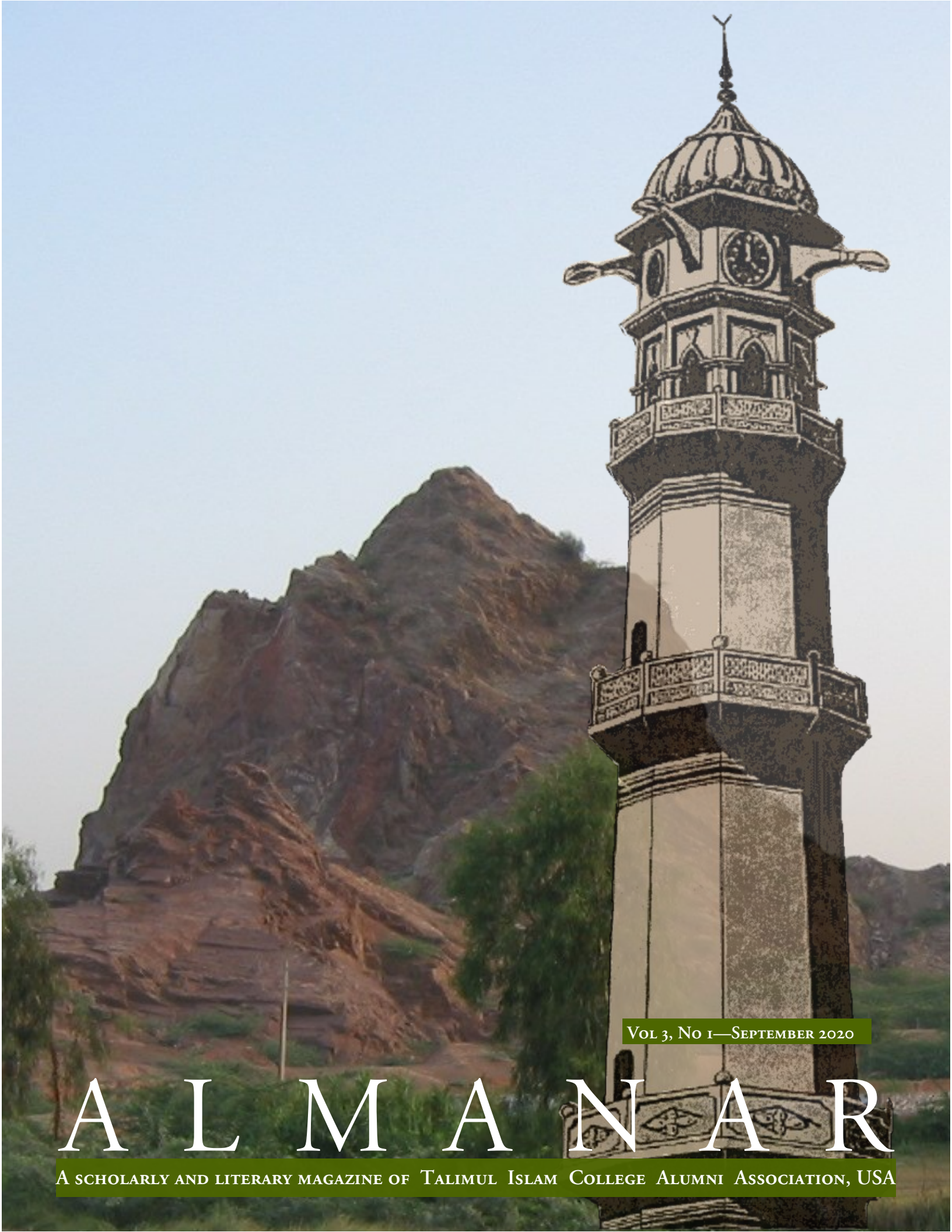
Vol 3, No 1—September 2020
ALMANAR
A scholarly and literary magazine of Talimul Islam College Alumni Association, USA